بحث کرکے اس کی اہم خصوصیات نمایاں کی ہیں، دوسرے باب میں ضرب الامثال کی سماجی، اخلاقی، تاریخی، لسانی اور فلسفیانہ اہمیت واضح کی گئی ہے، تیسرے باب میں کہاوت کے آغاز وارتقا کی داستان بیان کی ہے، اس میں کہاوت کے وجود میں آنے کے اسباب وعوامل کا تذکرہ بھی ہے، چوتھے باب میں اسکی وسعت، ہمہ گیری اور عالمگیر مقبولیت کو واضح کرنے کے لیے اس کی قدامت اور مختلف زبانوں کے ادبیات میں اس کے رواج وغیرہ کا ذکر ہے، پانچویں باب میں اردو کہاوتوں کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے، اس غرض سے صوفیائے کرام کے ملفوظات، دوہے، کبت اور اشعار نیز لوک کہانیوں کا جائزہ لیا ہے، چھٹے باب میں اردو کہاوتوں کے سماجی ومعاشرتی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے، اس مقصد سے ہندوستان کے مختلف طبقوں، ذاتوں، پیشوں، سماجی رشتوں، زرعی معیشت، خورد ونوش کی اشیا اور ملبوسات وغیرہ کے تعلق سے رائج کہاوتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتویں باب میں اردو کہاوتوں کے لسانی پہلوؤں کا ذکر ہے، اس سے ان کی ادبی قدر وقیمت کا تعین بھی ہوتا ہے، آخر الذکر دونوں ابواب مقالہ کی جان اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں، آخر میں ایک ضمیمہ ہے، اس میں اردو ضرب الامثال حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کیے گئے ہیں، لائق مرتب نے محاورہ، تلمیح اور روزمرہ وغیرہ سے کہاوتوں کو خلط ملط نہیں کیا ہے، اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، آج کل کے سہولت پسند طلبہ واساتذہ پامال اور آسان موضوعات ہی کو تحقیق کا موضوع بناتے ہیں، لیکن ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اولاً تو ایک اہم اور انوکھے موضوع کا انتخاب کیا اور پھر پوری تلاش وجستجو سے کام لے کر اس کا حق ادا کیا، ان کی سعی وکاوش سے اردو کے ادبی وتحقیقی ذخیرہ میں ایک قابل قدر اور مفید کتاب کا اضافہ ہوا جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، کتاب مواد ومعلومات سے پُر ہے، اس سے ترتیب وبیان کی خوبی کے علاوہ مصنف کے اچھے تحریری ذوق وسلیقہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بعض اقدامات اور طریقۂ کار سے چاہے اختلاف کیا جائے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا سے جاتے جاتے وہ اپنے ملک کو جمہوریت کا تحفہ دیتے گئے، جس کے لیے پاکستانی عوام ہی نہیں، دنیا کے تمام جمہوریت پسند لوگوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیے، گزشتہ ماہ پاکستان میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں طرح طرح کے خدشات ظاہر کیے جارہے تھے، اور شناختی کارڈ کے التزام کی وجہ سے بھی خاصی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، مگر ضیاء الحق مرحوم کے دونوں دست راست غلام اسحاق خان اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے اتنی خوبصورتی سے پُرامن انتخابات کرائے کہ کسی کو کسی قسم کی بدعنوانی کا شک وشبہہ نہیں ہوسکتا۔

گو انتخابات میں کسی پارٹی کو واضح اکثریت نہیں حاصل ہوئی، تاہم پیپلز پارٹی سب سے بڑی اور طاقت ور پارٹی کی شکل میں نمایاں ہوکر سامنے آئی، اس لیے غلام اسحاق خان نے اس کی سربراہ مسز بے نظیر بھٹو کو حکومت کی تشکیل کی دعوت دے کر بڑے ہوش وتدبر کا ثبوت دیا، اور اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا جس کے نتیجے میں اس سے پہلے پاکستان کو اپنے ایک حصہ سے ہاتھ دھونا پڑا تھا، مسز بھٹو کا یہ اقدام قابل ستائش ہے کہ وہ کدورت اور انتقامی جذبہ سے باز رہیں گی اور اپنے سیاسی مخالفوں کے ساتھ ٹکراؤ اور صف آرائی کی پالیسی اختیار نہ کرکے ملک کی فلاح وبہبود سے سروکار رکھیں گی، انھوں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں صاحبزادہ یعقوب خان کو وزیر خارجہ کے عہدہ پر برقرار رکھکر اور غلام اسحاق خان کو متفقہ صدارتی امیدوار بنانے کی پیش کش کرکے اس کا عملی ثبوت بھی دیدیا، غلام اسحاق خان ایک لائق سول افسر ہیں، قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھالنے اور انتخابات سے لیکر وزارت سازی تک ہر ہر مرحلہ پر ان کی فراست، دوراندیشی اور غیر جانبداری کا مظاہرہ برابر ہوتا رہا ہے، گویا صدر کے عہدہ کے لیے انھوں نے پہلے ہی اپنے کو ہر طرح سے اہل ثابت کردیا ہے، اس لیے

موجودہ حالات میں صدر کے لیے ان سے بہتر کوئی امیدوار نہیں ہوسکتا، ان کا انتخاب بالکل بجا اور پاکستان کے عین مفاد میں ہوگا۔ یہ چھپ رہا تھا کہ ان کے صدر ہوجانے کی اطلاع آگئی

ہندوستان نے پاکستان میں جمہوریت کے قیام اور مسز بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم نامزد کیے جانے کا خیر مقدم کیا ہے، اس کے اس پُرخلوص جذبہ کی قدر کرتے ہوئے مسز بے نظیر بھٹو نے بھی اپنے پڑوسی ملک ہندوستان سے بہتر تعلقات بنائے رکھنے پر زور دیا ہے، دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم نے شملہ سمجھوتے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جس سے ایک دوسرے کے لیے دونوں ملکوں کے خیر خواہی اور فراخ دلی پر مبنی نیک جذبات کا اندازہ ہوتا ہے، وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سارک چوٹی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان تشریف لے جانیوالے ہیں، پاکستانی وزیر اعظم اس کا بے چینی سے انتظار کررہی ہیں، تاکہ ہندوستانی وزیر اعظم سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا انھیں موقع ملے، جس سے دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں مدد ملے گی، اب جبکہ دونوں جگہ عوام کے منتخب نمایندوں نے حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں، تو ہماری دعا ہے کہ یہ اپنے تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز کریں، جس میں ہماری مشترکہ تہذیب وروایات اور تاریخ کی سرخیاں نمایاں طور پر نظر آئیں، اور اقبال کی طرح وہ بھی یوں نغمہ سنج ہوں

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں ؎ بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقش دوئی مٹادیں

دار المصنفین کے خیر خواہوں اور خدمت گذاروں کو یہ خبر سن کر بڑا رنج وغم اور سخت ملال ہوا کہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ایک معزز، سرگرم مخلص اور قدیم رکن جناب منشی عبد العزیز صاحب انصاری یکم دسمبر کو بمبئی میں وفات پاگئے انا للہ وانا الیہ راجعون، یہاں سے ان کا تعلق حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے دور میں قائم ہوا، جو بعد میں مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا، وہ بمبئی میں رہتے تھے لیکن ان کا وطن اعظم گڈھ ہی تھا، اس لیے دار المصنفین سے ان کا بڑا گہرا قلبی لگاؤ اور جذباتی تعلق تھا،

اکثر کہا کرتے تھے کہ اس نے ہماری عزت و شہرت میں چار چاند لگا دیا ہے، اس سرزمین پر وہ لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے اس کو علم و فن کا لالہ زار بنا دیا ہے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں نہایت پابندی سے تشریف لاتے، ان کے قیمتی مشوروں سے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہونچا، مشکل وقتوں میں اس کے لیے سینہ سپر رہتے، دارالمصنفین کو مالی اعانت کی ضرورت ہوتی تو اس کے کارکنوں کو بمبئی بلاتے اور اپنے یہاں دعوتوں پر اصحاب ثروت کو مدعو کرکے اس کی امداد کرنے پر آمادہ کرتے، شبلی کالج سے بھی خاص تعلق رکھتے، اور اس کی ترقی سے بڑی دلچسپی لیتے، تقریباً چالیس برس سے اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہتے تھے، ان کا انتخاب ہمیشہ بلا مقابلہ ہوتا تھا۔

ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن بڑے علم دوست اور اردو و فارسی کا اچھا شعری ذوق رکھتے تھے، وہ بمبئی میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے، جہاں ایک سے بڑھ کر ایک تاجر تھے مگر جو عزت، نیک نامی اور قدر و منزلت انھوں نے حاصل کی وہ کم کسی کو نصیب ہوئی، وہ مہمانوں کے لیے ہر وقت بچھے رہتے تھے، ان کی ساری کمائی ان ہی کے لیے وقف رہتی، ان کا گھر اعظم گڈھ اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں کا بے تکلف مہمان خانہ تھا، لوگ وہاں مہینوں قیام کرتے مگر ان کی پیشانی پر بل نہ آتا، وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتے، اپنی ذات پر کچھ خرچ کرنے میں ان کو بڑا تکلف ہوتا، مگر دوستوں، عزیزوں اور ضرورتمندوں کی مدد کرکے ان کو بڑا سرور ملتا، ان کی ذات شرافت، مروت، اخلاص، محبت اور دلجوئی کی چلتی پھرتی تصویر تھی، ان کی وفات سے دارالمصنفین اپنے ایک بہت ہی مخلص اور غمگسار رکن سے محروم ہوگیا، اللہ تعالےٰ ان کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

افسوس ہے کہ ۶؍ دسمبر کو منشی اقبال احمد صاحب بھی حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئے، وہ ماہر کاتب تھے، اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کی خدمت میں گذار دی، اس کی اکثر کتابیں ان ہی کے خط سے نکلی ہیں، اپنی خوشنویسی کی وجہ سے اتر پردیش اردو اکاڈمی سے انعام بھی حاصل کیا، ابصارت کی کمزوری کی بنا پر کتابت ترک کر دی تھی، ان میں غرور و گھمنڈ نہ تھا، اپنی نرم اور شیریں گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لیتے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگذر کرے اور انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔

مقالات

عظیم ندوی، فلسفی و صوفی

از مولانا غلام محمد صاحب کراچی

مولانا عبد الباری ندوی سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے متعلق ان کے مشہور معاصر فلسفی و ماہر نفسیات مولانا عبد الماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں،

"مشترک موضوع ہمارے اُن کے مغربی فلسفہ اور عقلی علوم تھے، نوجوانی کے جوش میں زبان پر اور قلم سے ہر وقت یہی بحثیں جاری رہتی تھیں، ایک مردم شناس مبصر نے اسی وقت یہ فقرہ کہہ ڈالا تھا کہ ماجد صاحب کا مطالعہ جتنا بھی ہو اور فلسفہ کی کتابیں جتنی بھی انھوں نے پڑھ ڈالی ہوں لیکن فلسفی کہلانے کے مستحق باری صاحب ہی ہیں۔

یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں تو معیار پائے برو کت بے چند "عمر بھر بدستور بنا رہا البتہ وہ فلسفی سے ترقی کرکے متکلم اور صوفی بن گئے، لیکن عقلیت جیسے ان کا سرشت میں تھی باوجود اپنے تقشف و تصلب کے وہ محض تسبیح و سجادہ کے صوفی ہوکر نہیں رہے بلکہ بقدر ضرورت برابر مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً طبیعات سے ربط اور مطالعہ قائم رکھا"[1]

---

[1] مختصر تعارف "مذہب اور سائنس" مصنفہ مولانا عبد الباری ندوی۔

اس سے پہلے خود ندویوں کے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی سیرۃ النبی جلد سوم،
مشتمل بر دلائل و معجزات کی تصنیف میں "دلائل و معجزات اور فلسفۂ جدیدہ" کا باب مولانا عبد الباری
ندوی سے لکھوا کر شامل فرمایا تھا اور مولانا کے متعلق یہ تحریر فرمایا کہ

"ہمارے زمرۂ علماء میں فلسفۂ جدید کا واقف کار مولانا عبد الباری سے بڑھ کر کوئی نہیں"[1]

مشہور عالم و محدث مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے مولانا عبد الباری کی رحلت پر جوش و ہوش کی
متلاطم کیفیت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"جدید فلسفہ اور جدید الٰہیات پر ان کی نظر اور ہمہ گیری حیرت انگیز تھی... ان کے افکار کو
جس جستجو اور عرق ریزی سے یکجا کر کے ان سے استنباط کرتے تھے، انہی کا حصہ تھا... سائنس
اور مذہب جیسی نافع و عظیم تصنیف سے تمام فلاسفہ اور ملاحدہ کے سر پہ جوتے لگائے
اور اتمام کی حجت پوری کر دی"[2]

مولانا پیدا ہی فلسفی ہوئے تھے، انھیں طالب علمی کے دوران خصوصی دلچسپی فلسفہ و کلام ہی سے
رہی اور خوش قسمتی سے علامہ شبلی جیسا ماہر معقولات استاذ انھیں میسر آیا جو خود بھی جوہر قابل کی
تلاش میں رہتا اور جوہر کی تراش اور جلا بخشی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، مولانا عبد الباری اپنی
"سرگزشت" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"علامہ ہی کے زمانہ سے مصر کے رسائل و اخبار آنے لگے تھے، ان میں ایک رسالہ "المقتطف"
نام کا ہوتا جو کسی عیسائی کے زیر ادارت تھا، اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کی چیزیں
زیادہ ہوتیں، مجھ کو یوں بھی منقولات کے بجائے معقولات سے زیادہ مناسبت تھی،
ساتھ ہی قدیم معقولات کی شروح در شروح، حواشی در حواشی کے قیل و قال سے الجھن بھی

۱؎ سیرۃ النبی جلد سوم پہلا ایڈیشن۔ ۲؎ بصائر و عبر، ماہنامہ بینات (کراچی) بابتہ اپریل ۱۹۷۶ء

بہت ہوتی تھی، خدا بھلا کرے علامہ ممدوح کا کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں نصاب میں
جو تبدیلیاں کیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جنھوں نے میری دلچسپی قدیم معقولات سے بھی
کچھ بڑھا دی مثلاً "شرح حکمۃ العین" و "شرح حکمۃ الاشراق" جیسی کتابوں نے بالخصوص
"شرح حکمۃ الاشراق" پڑھانے والے استاذ مولانا شیر علی حیدرآبادی تھے جنھوں نے
اپنے خاص طرز تعلیم سے میری رغبت اور بڑھا دی"[1]

اپنے مضمون "سیرۃ السید" میں مولانا تحریر فرماتے ہیں

"ندوہ میں نہ صرف (علامہ سید سلیمان ندوی سے) طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی
بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی۔ استاذ مرحوم و مغفور علامہ نعمانی
کی مجالس میں سالہا سال ان کے پیچھے صف نعال میں شریک رہا مگر سید صاحب کے
علم و فضل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات ان ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک
مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ ان ہی کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی"[2]

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی دلچسپی معقولات ہی سے تھی البتہ طالب علمی ہی کے
زمانہ میں ان میں یہ تڑپ بھی پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھ کر جدید فلسفہ، نفسیات
اور کلام کا راست مطالعہ کر کے اس میں دستگاہ حاصل کی جائے۔ ان کے اسی جذبہ کی پوری
ہمت افزائی علامہ شبلی نے کی اور وہ اپنے خداداد شاکلہ اور اس کے ساتھ سعی و محنت کے ذریعہ
فلسفۂ اسلام اور فلسفۂ مغرب کے تقابلی ماہر اور کامیاب استاد بن گئے اور جامعہ عثمانیہ کے
شعبۂ فلسفہ میں انھیں خاص مقام حاصل رہا۔ میرے ہم زلف جناب حمید اللہ خاں ایم۔ اے
(فلسفہ) جامعہ عثمانیہ (مقیم لندن) مولانا عبد الباری ندویؒ کے شاگرد رہے ہیں، وہ اپنے

۱؎ مذہب اور سائنس ص ۱۰۔ ۲؎ سلیمان نمبر ماہنامہ معارف بابتہ مئی ۱۹۵۵ء ۳؎ ایضاً

ایک محبت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں

"فلسفہ کے چھ پرچوں میں ایک پرچہ اسلامی فلسفہ بھی تھا جس کے استاد پروفیسر عبدالباری ندوی تھے، مولانا کے نام سے پہلے سے شناسائی تو تھی لیکن پہلی مرتبہ انہیں اسلامی فلسفہ کی کلاس ہی میں دیکھا، مولانا کی شانِ وجاہت یہ تھی کہ سرخ و سفید رنگ کتابی چہرہ، موزوں قامت، چھریرا لیکن نہایت متوازن جامہ زیب بدن، اس پر لباس میں شیروانی اور تنگ مہری کا پاجامہ، شیروانی نہایت نفیس کھادی کی اور اس پر کپڑے کی کشتی نما ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

اسلامی فلسفہ کی کلاس میں پہلے دن مولانا نے ہر طالب علم سے یکے بعد دیگرے سوال کیا کہ اس نے فلسفہ کو بطور اختیاری مضمون کیوں منتخب کیا؟ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے کسی رسالہ میں ایک مضمون "شعور و لاشعور" پر پڑھا تھا بنابریں مجھے فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مولانا میرے جواب سے مطمئن ہوئے کیونکہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی جواب نہ دے سکے تھے،

فلسفۂ اسلام میں مولانا کا طرز تعلیم انفرادی حیثیت رکھتا تھا، کلاس میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے طلبہ کی حاضری لیتے اور رجسٹر حاضری بند کرنے کے بعد متعلقہ موضوع پر تقریر شروع فرماتے، انداز بہت سادہ سلیس لیکن بے حد رواں ہوتا، موضوع کے ہر ہر جزو کی اس طرح وضاحت فرماتے کہ ہم ہمہ تن گوش بنے رہتے اور لکچر اس طرح توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے کہ دوران لکچر نوٹس لینا ممکن نہ ہوتا، لیکن مولانا ہماری تشنگی اور طلب کو محسوس فرما کر لکچر ختم ہونے کے بعد، گھنٹہ ختم ہونے سے پہلے کچھ نوٹس لکھوا دیتے، لیکن یہ نوٹس ان کے تفصیلی لکچر کا ملخص ہوتے، گو ان نوٹس سے پوری تشفی تو نہ ہوتی تاہم

امتحانی نقطۂ نظر سے یہ نوٹس بہت اہم ہوتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اپنے مضمون فلسفۂ اسلام پر مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن ان کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں استنادی حیثیت رکھتے تھے بلکہ مغربی فلسفہ پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان دونوں فلسفوں کا موازنہ و محاکمہ جس طرح مولانا فرماتے، یہ بات کہیں اور نظر نہ آتی، اسلامی فلسفہ کی کلاس میں مولانا بیک وقت ہمارے سامنے دونوں (فلسفوں) کی خوبیوں اور کوتاہیوں کو نمایاں کر کے دکھاتے۔

برکلے کی رد مادیت پر تصانیف کو مولانا نے بکمال خوبی اردو میں منتقل کیا تھا لیکن مولانا کی ژرف بینی اور حقیقت شناسی ان کے معرکۃ الآرا مقالہ "مذہب اور عقلیات" میں ظاہر ہوتی ہے، یہ مقالہ مولانا کے تحلیلی انداز نظر کا شاہکار ہے جس میں آپ نے مذہب اور فلسفہ کے حدود کی صحیح صحیح نشاندہی کی ہے، یعنی عقل محض چراغ راہ ہے منزل نہیں وہ راستہ کی صرف رہنمائی کر سکتی ہے، منزل رسی کے لئے مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے"۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب مولانا کے پاس فلسفہ کی کوئی ڈگری نہ تھی مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ کی کوشش سے انہیں ستمبر ۱۹۲۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ میں نہ صرف پروفیسر کی حیثیت سے لیا گیا بلکہ صدر شعبۂ فلسفہ چونکہ تعلیمی رخصت پر بیرون ملک گئے ہوئے تھے اس لئے ان کی قائم مقامی بھی مولانا کے سپرد کر دی گئی اور اس طرح دو سال گزر گئے اب مسئلہ مولانا کے استقلال کا آیا، اصولاً مولانا مستقل پروفیسر نہیں بنائے جا سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس فلسفہ کی کوئی سند نہ تھی مگر مولانا کے معاملہ کو استثنائی حیثیت دیتے ہوئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خان مرحوم کی خدمت میں خصوصی عرضداشت پیش کی گئی، مولانا

حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے لکھا کہ

"ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے جس کا اندازہ سرکار

خود رسالہ "مذہب و عقلیات" کی چند سطر دیکھ کر ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں"[1]

چنانچہ گوہر شناس شاہ دکن نے "مذہب و عقلیات" کی بنا پر مولانا کے بحیثیت پروفیسر مستقل کیے جانے کی منظوری عطا فرما دی۔ یہ مولانا کے فلسفیانہ کمال کی شہادت نفسی تھی کہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب — گر دلیلش باز خواہی رو متاب

چنانچہ جب ترقی کا مسئلہ آیا اور اس میں یوروپی ڈگری کی شرط تھی تو اس وقت بھی مولانا کے فلسفیانہ تراجم کو ڈگری کا بدل تسلیم کر لیا گیا۔

تراجم اور ان کا امتیاز مولانا نے فلسفہ، نفسیات اور اخلاق کی بعض اہم انگریزی تصانیف کے جو تراجم کئے، فلسفے کے ڈاکٹروں میں بھی اس کام کی نظیر شاید ہی ملے۔ ذیل میں ان تراجم کی فہرست[2] ملاحظہ ہو:۔

	کتاب کا اصل نام	مصنف	ترجمہ کا نام
۱-	MANUAL OF ETHICS	MACKENZIE J.S.	علم الاخلاق
۲-	PRINCIPLES OF HUMAN KNOW-LEDGE	BARCLY	مبادی علم انسانی
۳-	PRAGMATISM	JAMES WILLIAM	فلسفۂ نتائج
۴-	HUMAN UNDERSTANDING	HUME DAVID	فہم انسانی

[1] "مذہب اور سائنس" زیر عنوان "سرگزشت" صفحہ ۲۳ [2] پچھلے سال (یعنی اکتوبر ۱۹۸۷ء) کل ہند مجلس تعمیر ملت حیدرآباد دکن کی دعوت پر راقم الحروف کا جانا حیدرآباد دکن ہوا تو جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے مولانا عبدالباریؒ کے تراجم کی یہ فہرست محب مکرم احمد علی صاحب کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔

	کتاب کا اصل نام	مصنف	ترجمہ کا نام
۵	AN INTRODUCTION TO METAPHYSICS	BERGSON HENRE	مقدمہ مابعد الطبیعیات
۶-	DISCOURSES ON METHODS AND METAPHYSICAL MEDITATIONS	DECARTE RENE	طریق اور تفکرات
۷-	ETHICS	DENE, J.& J.H TAFTS	اخلاقیات
۸-	MANUAL OF PSYCHOLOGY	STOUT	جدید نفسیات

یوں تو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ سے مختلف علوم و فنون کی ۵۰۰، کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے اور ان سے اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہوا اور اس کا علمی وزن بھی بڑھا مگر مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان پر ترجمہ کا گمان ہی نہیں ہوتا، مولانا بڑے سے بڑے فلسفی اور ماہر نفسیات کے خزانۂ خیال اور طرز ادا پر اس طرح قبضہ جما لیتے ہیں اور انگریزی محاورات کو اردو محاورات میں اس خوبی سے منتقل فرما لیتے ہیں کہ ان کے تراجم مصنفین کی اصل (original) تصنیفات ہی محسوس ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے راقم الحروف سے فرمایا کہ "آپ کے ہاں کا کوئی ترجمہ ہمارے مولانا عبدالباری کے تراجم کی ٹکر کا نہیں، ترجمہ کی خوبی تو یہی ہے کہ وہ ترجمہ محسوس نہ ہو"۔

فلسفیانہ محاکمات تراجم کے علاوہ مولانا کے فلسفیانہ محاکمات ان کے تبحر فن کی بڑی شہادت ہیں جو ان کے مقالات "دلائل و تجربات اور عقلیات جدیدہ، مذہب و عقلیات اور تصنیف مذہب اور سائنس میں ہیں اور ان کے تحریر فرمودہ مقدمات میں جابجا ملتی ہیں، اس کی ایک مثال "فہم انسانی" (ہیومن انڈر اسٹینڈنگ از ڈیوڈ ہیوم) کے مقدمہ سے یہاں پیش کی جاتی ہے۔

[1] مضمون "دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ" از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ شائع شدہ سہ ماہی مجلہ "ادبیات" بابتہ اپریل تا جون ۱۹۸۸ء۔ اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

مقدمہ کے مباحث کو سمیٹتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔

"آخر میں اصل نتیجہ پر پھر ایک نگاہ ڈال لو، جدید فلسفہ پہلے ہی قدم پر جس "سوچ" میں پڑ گیا تھا کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" اس کے بعد عقل اور فلسفہ منطق اور استدلال کی طاقت سے یہ بالکل باہر ہو گیا کہ وہ پھر اس سوچ سے ایک قدم بھی باہر نکال سکے، لاک نے بہت زور لگایا کہ کم از کم "صفات اولیہ" کو باہر لا سکے مگر تم نے دیکھا کہ خود لاک ہی کی دلیل سے برکلے نے ان کو پھر "صفات ثانیہ" کی طرح اندر ہی پہنچا دیا، اور آگے چل کر ساری تاریخ فلسفہ بس ایک "گردش پرکار" ہو کر رہ گئی کہ ہر قدم، ہر پھر کر اسی سوچ کے دائرہ میں پڑتا رہا۔

برکلے کی بے پناہ منطق نے اسی دائرہ کے اندر بند کر کے مادہ کا نام لینے تک کی گنجائش نہ چھوڑی اور ہیوم نے بعینہٖ اسی منطق سے جو دوسرا نتیجہ نکل سکتا تھا، نکال دیا، کہ اگر مادہ نہیں تو روح بھی نہیں، اس کے بعد رہ کیا گیا؟ وہی خالی سوچ یا مجرد احساسات و خیالات جو نہ کسی باہر کے مادی جوہر کے آثر ہیں اور نہ کسی اندر کے روحانی جوہر پر قائم، گویا یوں ہی آپ ہی آپ ٹنگے ہیں۔ "سوچتا ہوں" کا "میں" بھی غائب اور نرا سوچ ہی سوچ فلسفہ کے ہاتھ میں رہ گیا۔

نیز اس سوچ کے مختلف احساسات، خیالات اور ارادات وغیرہ میں باہم جو ایک ربط اور وابستگی نظر آتی تھی، جس کو علت و معلول کہا جاتا تھا یعنی ایک دوسرے پر لازماً موقوف اور اس کا محتاج ہونا، ہیوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس علیت و معلولیت، لزوم و احتیاج کے واقعہ کو بھی ایک طرح کے "سوچ" (یعنی ذہنی عادت) ہی میں تبدیل کر دیا،

اس طرح ڈیکارٹ سے صرف ہیوم تک ہی آتے آتے فلسفیانہ علم و یقین کے پاس نہ مادہ رہا نہ روح، نہ جسم نہ نفس، نہ میں نہ تو، نہ زمانہ نہ غیری، نہ علت نہ معلول نہ قوت نہ خاصیت، نہ لزوم نہ وجوب، نہ اندر نہ باہر، رہے دے کر صرف شعور یا احوال شعور، خیالات اور محض خیالات جو نہ کسی شئے کے ہیں اور نہ کسی شخص کے، یعنی وہی نرا "سوچ"

اب اس سے بڑھ کر انسانی عقل کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا کیا دیکھئے کہ دیکھنے کے لئے جتنا زیادہ زور لگاتے ہیں اتنا ہی زیادہ اور اندھے ہوتے جاتے ہیں،

شاید اسی طرح کی عقل آزمائی کے بعد کچھ ہشیار "دیوانے" بن جاتے ہیں ؂

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را[1]

فلسفیانہ تصانیف | ذیل میں مولانا ندوی کی فلسفیانہ تصانیف کے بارہ میں مختصر معلومات درج ہیں۔

(۱) **دلائل معجزات اور عقلیات جدیدہ** :- یہ مقالہ سیرۃ النبی جلد سوم میں صفحہ ۱۱۷ سے صفحہ ۲۱۰ تک پھیلا ہوا ہے، اس میں امکانِ معجزات، شہادتِ معجزات، استبعادِ معجزات، یقینِ معجزات اور غایتِ معجزات کے جلی عنوانات کے تحت جدید فلاسفہ، معقولین اور سائنس دانوں کے افکار و خیالات کا تجزیہ اور ان پر محاکمہ کرتے ہوئے منکرین معجزات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہیں اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ

"اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابوجہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی ساتھ مدعیٔ نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاف کے لحاظ سے بجائے خود اس کی مؤید ہے تو معجزہ (یعنی خارق عادت) کا کیا ذکر ہے، خود پیغمبر

---

[1] "فہم انسانی" مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ صفحات ۲۲ و ۲۴

کی آواز و صورت ہی معجزہ ہے[1]

"در دل ہر کس کہ دانش را مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است"

یہ لٹریچر خصوصاً موضوع سیرت کے عظیم عالمی تحریری ذخیرہ میں یہ مقالہ اپنی نوعیت کا پہلا اور اس وقت تک غالباً آخری علمی کارنامہ ہے۔

۲۔ **مذہب و عقلیات**: یہ مولانا کا بہت مشہور، مقبول اور بے نظیر مقالہ ہے، جس کو پڑھ کر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے بہت سچ فرمایا کہ اس کے ذریعہ:

"فلسفہ نے مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے"

اور غیر منقسم ہندوستان کی سب سے عظیم علمی و روحانی شخصیت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ

"یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے، اگر اب بھی کوئی اس میں پناہ نہ لے تو اس کی مرضی"[1]

اس مقالہ میں دہریت اور لاادریت کی تردید کی گئی ہے، مادیت کے پرخچے اڑائے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ علت اولیٰ کا پتہ لگانا سائنس کے دائرہ بحث سے خارج ہے نیز مذہب و سائنس میں تصادم کے خیال کو اس قدر مضحکہ خیز قرار دیا گیا ہے جتنا کہ ریل گاڑی اور سمندری جہاز میں تصادم کا تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے، وہ مذہب کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ رسالہ جامعہ عثمانیہ کی دینیات لازم (بی۔ اے) کے نصاب میں شامل رہا۔

۳۔ **مذہب اور سائنس**: یہ کتاب گو مذہب و سائنس پر ہے مگر چونکہ سائنس، خصوصاً طبیعیات، جو یہاں موضوع بحث ہے، اپنی انتہا پر فلسفہ ہی بن جاتی ہے اس لئے فلسفیانہ تصانیف کے

۱۔ یہ پورا جملہ مولانا کی زبانی سنا ہوا ہے۔

ذیل ہی میں ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ مولانا کی عمر کی آخری تصنیف ہے اور ان کا شاہکار ہے بلکہ اس موضوع کے لٹریچر میں یہ چوٹی کی تصنیف ہے۔ اس پر مقدمہ عصر حاضر کے ماہر طبیعیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب کا ہے جن کی شہادت اور تحسین کتاب کو ہر تحسین غیر سے مستغنی کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"یوں تو میں ایک عرصہ سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس گہری نظر سے ان حقائق کا مطالعہ کر رہے ہیں جو فلسفہ اسلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہو رہے ہیں لیکن اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے اور انھوں نے قدیم یونانی فلسفہ سے لیکر آج تک بڑے بڑے علماء اور حکماء کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں"[1]

آخر میں ڈاکٹر صاحب ممدوح تحریر فرماتے ہیں:۔

"بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بمصداق 'کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کیلئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (UNIVERSAL MIND) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ حضرت مولانا عبد الباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں

۱۔ مذہب و سائنس صفحات ۲۲، ۲۷۔

یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ ایک نہایت اہم اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے جو انھوں نے اس کبر سنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کر کے انجام دیا ہے[1]۔"

اس معرکۃ الآرا تصنیف کے متعلق قابل اظہار بات یہ بھی ہے کہ یہ ایک ایسے سچے اور پکے مسلمان فلسفی اور ماہر طبیعیات کی ادعائی تصنیف ہے جو بیک وقت مادی کائنات کی حقیقت اور ماورائے عقل و حواس عالم کے حقائق کا واقف کار تھا اور زمان و مکان کے بھید کو سمجھتا تھا جو صحیح معنوں میں سے

بہ جلوت اند کمندے بہ مہر و مہ پیچید   بہ خلوت اند زمان و مکاں در آغوش اند

کا مصداق تھا۔

میرے لئے یہ بات وجہ سعادت و شرف ہے کہ مولانا کی اس شاہکار تصنیف کی صورت گری یعنی ترتیب و عنوان بندی میں مولانا نے شامل فرمالیا تھا[2] اور بحمد اللہ خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا میسر آیا۔ مولانا کے مکتوب مورخہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

لہ مذہب و سائنس صفحات ۳۲ و ۳۳، سلہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے تو لکھا ہی تھا کہ مذہب و سائنس کے مسودہ کی صورت گری کی خدمت انجام دوں مگر اس کے ساتھ ساتھ خود مخدومی ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی صاحب کو بھی ہدایت دی تھی کہ وہ مقدمہ تحریر فرما کر مسودہ مجھ کو بھیج دیں۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے اس کا اتنا اہتمام فرمایا کہ اسلام آباد سے کراچی کا سفر کر کے غریب خانہ پر تشریف لائے اور دست بدست کتاب کا مسودہ میرے حوالے فرمایا اور تاکید فرمائی کہ حضرت مولانا کے ارشاد کی تعمیل کر کے اس بیش بہا مسودہ کو میں ڈاک سے نہیں بلکہ اعتماد کے کسی جانے والے کے ہاتھ لکھنؤ بھجوادوں۔

کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں بھیجئے اتنی خوشخبری تو سن ہی لیجئے کہ وہ کتاب جس پر آپ نے بھی خاصی محنت فرمائی تھی، کسی نہ کسی طرح مذہب و سائنس کے نام سے چھپ کر مجھ تک دو نسخے تو پہنچ ہی چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ مجھ کو سب سے زیادہ شرمندگی اس کی ہے کہ کچھ تشکر کے سلسلے میں میں نے آپ کا بھی شکریہ ایک دو لفظوں میں ادا کر دیا تھا وہ سرے سے تشکر کے عنوان سے غائب ہو گیا ہے۔"

۴۔ کلامیات سائنس:۔ مولانا کی یہ کتاب مکمل تو ہوگئی تھی مگر نظر ثانی باقی تھی اس لئے چھپنے سے رہ گئی۔ ۷ اگست ۱۹۶۹ء کے الطاف نامے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"آجکل تو آپ کی یاد بے طرح ایک دینی غرض سے آرہی ہے۔ کلامیات سائنس کو مکمل ہوئے ایک سال ہوتا ہے اور چھ سات مہینے ولایت[1] میں پڑی رہی، اب تین چار دن پہلے علی میاں نے آکر، اپنے مسیح کو ساتھ لاکر، از اول تا آخر سماعت فرمائی۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس حصہ کو کلامیات قرآن کی تکمیل تک روکا نہ جائے لیکن ایک بڑا مرحلہ عنوانات قائم کرنے کا ہے اور اس معاملہ میں نظام صلاح و اصلاح میں آپ کی عنوان بندیوں نے مجھ کو اس بارے میں آپ کا بہت معتقد کر دیا ہے۔"

اب معلوم نہیں کہ مولانا کی یہ قیمتی تصنیف کہاں ہے؟ محفوظ بھی ہے یا نہیں؟

فلسفہ سے متعلق مولانا کی رائے "اسباقِ زندگی"[2] کے نام سے مولانا نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا اس میں نفس فلسفہ کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ:۔

لہ یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ یا تو کلامیات سائنس کا مسودہ لندن کسی کے پاس بھجوایا ہوگا، اس کا ذکر ہے یا پھر لفظ کچھ اور ہے۔ سلہ یہ مضمون معلوم نہیں کہاں چھپا مگر مولانا نے اس کی قلمی نقل مجھے بھیج دی تھی جو محفوظ ہے۔

"فلسفہ کو اگر اس کے اصل موضوع و مقصد "تلاش حقیقت" کے بجائے صرف فلسفیا ڈاکٹر و پروفیسر بننے بنانے کے لیے نہ پڑھا جائے تو خالص عقل کی راہ سے فلسفہ، خصوصاً جدید فلسفہ سے زیادہ خدا تک پہنچانے والا کوئی دوسرا علم تعلقاً نہیں، البتہ نرا کتابی فلسفی ہی طرح خطرۂ ایمان ہے جس طرح نیم طبیب خطرۂ جان"۔

یہ رائے مولانا کے حقیقی بلند پایہ فلسفی اور ماہر استاذِ فلسفہ ہونے پر شاہد ہے۔

صوفیانہ پہلو مولانا عبدالباری ندوی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو ان کے گھر میں تصوف کی تجلیات تھیں۔ مولانا کے والد حضرت عبدالخالق رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نور اللہ مرقدہٗ کے مرید و خلیفہ تھے، جنھوں نے مولانا کی دینی تعلیم کے ساتھ ان کے اخلاقی و روحانی پہلو پر توجہ رکھی۔ مولانا کو گو ابتدا ہی سے زیادہ لگاؤ عقلیات و فلسفہ سے رہا مگر طبعی مزاج دنیا سے بے رغبتی ہی کا تھا جو آخرت طلبی اور زہد و ورع کی بنیاد ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے جب مولانا کا قیام حیدرآباد میں ہوا تو مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں مولانا کو حضرت محمد حسین چشتی نور اللہ مرقدہٗ کی روحانی صحبتیں میسر آئیں اور حضرت شیخ سے فیضیاب رہے۔ اپنے مضمون "اسباق زندگی" میں حضرت شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مولانا (حضرت محمد حسین) کی وجودی توحید کی تعبیر و تفہیم ایک طرف عقلیت و فلسفیت کے مارے ہوؤں کے حق میں ان کو لا الٰہ سے الا اللہ تک پہنچانے کے لئے بڑا کامیاب راستہ تھا، دوسری طرف وحدۃ الوجود کی تمام تعلیمات سے حلول و اتحاد یا خالق و مخلوق کی عینیت کے جو نتائج و خطرات پیدا ہوتے ہیں، ان کی بڑی شد و مد سے نفی فرماتے، الخالق و مخلوق کی غیریت پر پورا زور دیتے تھے، خالص کمال یہ تھا کہ اپنی اس وجودیت

کی توجیہ و تائید میں آیات و احادیث سے بہت کام لیتے تھے تاہم تھا یہ در اصل ایک فلسفہ ہی مگر مولانا کا یہ سراپا حال بلکہ مقام بن گیا تھا۔۔۔ نشہ کی تیزی و سرشاری تھی جس کے فیض سے کوئی بڑا محروم ہی اتنا محروم ہوتا ہوگا جو کچھ نہ کچھ ایمان کے ذوق و حلاوت کا اثر لے کر مولانا کی مجلس سے نہ اٹھتا ہو، ورنہ مولانا کے نظری فلسفہ کی حد تک بقول مولانا گیلانی کے مستثنیات کے سوا باقی "نہ بخشش" ہی رہتے۔ راقم کا شمار گو مستثنیات ہی میں تھا تاہم مولانا کے قدموں میں مجھ کو بھی سب سے بڑی دولت یہی ملی، پہلے پہل لا الٰہ الا اللہ کی ایمانی حقیقت کا انکشاف ہوا اور اس کی ایمانی حلاوت سے بقدر ظرف لذت شناس ہوا۔ اعلی اللہ مقامہٗ۔"

اس اعتراف کے باوجود مولانا کی روحانی تشنگی باقی تھی اور چونکہ خود بحر فلسفہ کے شناور تھے، اس لئے فلسفیانہ تصوف، قلب کو تسکین سے لبریز نہ کر سکا، چنانچہ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"وجودیت کا تصوف کے نام سے نظری فلسفہ کہ لا الٰہ الا اللہ کے روپ میں بھی فلسفہ ہی نظر آتا رہا، بلکہ عقل و فکر کی راہ بھی، جس راہ کی نشان دہی کرتی ہے وہ خالص ایمانی تصدیق یا "صدیقیت" ہی کی تھی اور خوب تحقیق ہوگیا کہ عالم شہادت میں رہتے ہوئے عالم غیب کے متعلق جب خود رسول کو اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ سے چارہ نہیں تو ابعد الطبیعاتی غیوب یا حقائق کے باب میں فلسفیانہ یا عقلی گدڑی کی حقیقت لال بجھکڑوں کے تکلف سے زیادہ ہو ہی کیا سکتی ہے، اس لئے سچ یہ ہے کہ مجھ کو تو عقل و فلسفہ کی بیچارگی ہی نے یہ بتایا کہ اللہ پر ایمان محمد رسول اللہ کی یافت کے بغیر لا الٰہ الا اللہ کی صحیح و معتبر یافت بھی ناممکن ہے، اللہ پر ایمان صرف وہی معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہو، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا تک رسول اللہ کے رسول اللہ ہونے اور جاننے پر موقوف ہے۔"

اس کے بعد خالص اتباعِ سنت والی نگاہ نے جو تلاشِ شیخ شروع کی تو دو ہستیاں یعنی حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الامۃ شاہ محمد اشرف علی تھانویؒ نگاہ میں سما گئیں، چنانچہ اول الذکر بزرگ کی وساطت سے ثانی الذکر قطبِ ارشاد کی بارگاہ تک رسائی میسر آئی، یہ جون ۱۹۲۶ء کی بات ہے[1]، شاہ تھانوی کو پا کر کامل علمی، روحانی اور ذوقی مناسبت ملی، مولانا نے خود کو اشرفی در کی "خاک" بنا دیا اور پھر "درجات" بھی بہت بلند پائے۔ ع خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند
اہلِ نظر نے تصدیق کی کہ "وہ عالم تھے، عارف تھے، صوفی باصفا تھے، سراپا اخلاص تھے، ورع و تقویٰ کا پیکر تھے، عصرِ حاضر کے علمائے ربانیین کے ممتاز فرد تھے[2]"

ربوبیت کا فیضان حکیم الامۃ شاہ تھانویؒ کی تربیت، توجہ اور کیمیا اثر نگاہ نے مولانا کو ایک زاہد، عابد، قانع، متوکل اور فانی کامل سالک مجذوب تو بنایا ہی مگر یہ اشرفی خوانِ فیض کی عطائے عام تھی، مولانا کی انفرادیت ایک اور جہت سے قائم ہوئی، ان پر ذاتِ حق کا خاص فضل یہ ہوا کہ اسمائے الٰہیہ میں سے اسم "رب" کی تجلی کے وہ مورد بن گئے۔ "ربوبیت" مولانا پر منکشف ہو گئی۔ میں نے اپنے اس احساس کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا تو وہ مسرور نظر آئے، اس لئے یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ وہ سالکین طریق کو ہر مرحلۂ حیات میں باری تعالیٰ کی ربوبیت ہی پر نظر رکھنے کی تاکید فرماتے تھے اور اسی کو حیات کے ہر زہر کا تریاق بتلاتے تھے، تنہا راقم احقر کے نام بیسوں مکتوبات میں مولانا نے اس بات کو دہرایا ہے حتیٰ کہ جو سندِ خلافت عطا فرمائی (جو ان کا استثنائی معاملہ تھا) اس میں بھی آخری جملے یہ تحریر فرمائے ہیں :-

---

[1] اس کی دلچسپ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حکیم الامۃ نقوش و تاثرات" از مولانا عبد الماجد دریابادی ص ۱۲۱ تا ۱۲۴

[2] مولانا محمد یوسف بنوری ، ماہنامہ بینات (کراچی) بابتہ اپریل ۱۹۷۶ء

"سالک کے لئے اس سے زیادہ آسان راستہ تجربہ میں آیا نہ سمجھ میں، کہ دنیا اور دین کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں ربوبیت کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرتا رہے۔"

"ربوبیت" کا "مشاہدہ" یہ مولانا کا انفرادی امتیاز یا "موئے و میانے" کے علاوہ خصوصی "آن" تھی ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

صوفیانہ تصانیف حضرت شاہ تھانوی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے معقول و منقول علوم میں، حقائق اسرار اور معرفت میں، بشری نفسیات اور تربیتِ نفس کی باریکیوں میں، مسلمانوں کے اجتماعی امراض اور ان کے معالجات میں وہ نظر عطا فرمائی تھی اور حضرت نے علاوہ عملی و اصلاحی کام کے نہایت کثیر اور بلند پایہ تحریری سرمایہ[1] چھوڑا ہے ان کے خلفاء میں یہ جذبہ عام نظر آتا ہے کہ ؎

دل میں لگا کے ان کی لو کر دے جہاں میں انتشار شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

ہمارے مولانا عبد الباری ندویؒ میں بھی بہ ہمہ علم و آگہی یہ جذبہ جنون عشق کے درجہ تک پیدا تھا، انھوں نے اپنے علمی کمالات شیخ کے علوم و معارف اور تجدیدی کارناموں کے جمع و ترتیب اور شرح و تہذیب میں وقف فرما دئے، شیخ کی تصنیفات جو ہزارہا ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں لفظاً لفظاً پڑھیں، شیخ کے ذہن و قلب تک رسائی حاصل کی اور پانچ عنوانات کے تحت شیخ کے تجدیدی کام کو مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا، اس کی تفصیل یہ ہے :-

---

[1] مکتبہ دار العلوم ۔ کراچی ۱۴ سے حضرت تھانویؒ کی تصانیف کی فہرست شائع ہوئی ہے، جس کو حضرت کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب فرمایا تھا، اس کی رو سے حضرت تھانویؒ کی کل تصانیف (۲۲۲) مجموعہ ہائے ملفوظات (۱۰) مواعظ مطبوعہ (۳۰۵) اور متفرق رسائل و مضامین (۸۹) ہیں۔

۱۔ جامع المجددین:۔ یہ عام کتابی سائز کے تقریباً (۶۰۰) صفحات میں آئی ہے،[1] اس میں حضرت شیخ کے اصلاحی و تجدیدی کارنامہ کی جامعیت کو پیش کیا گیا ہے اور حضرت کے مجدد عصری ہونے کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں اور جذبہ یہ کارفرما ہے کہ ملت محمدیہ بدعات و فسادات کی آمیزش سے بچ کر کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی سے آگاہ ہو جائے جو ہر صدی کے مجدد کا مشن ہوتا ہے اور اس کو نہ پہچان کر دینِ خالص تک رسائی دشوار ہوتی ہے۔ باقی کسی کی شخصی دعوت یا شخصیت پرستی کے پرچار کا خیال، تو ان باتوں کی تردید تو خود مجددِ وقت کی تعلیمات میں پیش کی گئی ہے۔

جامع المجددین کے عنوان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولانا اپنے شیخ کو تمام سابقہ مجددین کا جامع قرار دے رہے ہیں، حالانکہ ان کا منشا تو شیخ کے کمالات کی جامعیت کو دکھانا ہے اس پر جب بعض مخلص علماء نے توجہ دلائی تو مولانا نے فوراً اس کا نام بدل کر "تجدیدِ دین کامل" کر دیا تھا اور کتاب کا دوسرا ایڈیشن اسی نام سے چھپا ہے۔

۲۔ تجدید تصوف و سلوک:۔ یہ کتاب تقریباً (۵۰۰) صفحات میں آئی ہے اور اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ فنِ تصوف جو جوہر سے خالی ہو گیا تھا اور محض رسوم و بدعات یا چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طریقت و شریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرا لیا گیا تھا اور قرآن و سنت سے بے نیازی حاصل کر لی گئی تھی، حکیم الامت مجدد ملت شاہ تھانویؒ کے ذریعہ دوبارہ یہ فن شبلیؒ و جنیدؒ اور بسطامی و جیلانی اور سہروردی و سرہندی بزرگوں کے خزانے سے معمور ہو گیا رحمہم اللہ تعالیٰ اور یہ وہ شان تجدید تھی جو اس صدی میں مجدد وقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمائی تھی۔[2]

[1] میرے پیشِ نظر مولانا کی چاروں کتابیں لکھنؤ کی چھپی ہوئی ہیں، بعد کو نفیس اکیڈمی (کراچی) نے ان کو بڑے سائز پر چھاپا تھا۔ [2] تجدید تصوف۔ مقدمہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۶، ۱۷

مولانا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، اس کا عربی ترجمہ قدرے تلخیص کے ساتھ مخدومی مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی زیرِ نگرانی ہوا اور ممدوح کے پیش لفظ کے ساتھ مکتبہ دار الفتح دمشق سے "بین التصوف والحیاۃ" کے زیرِ عنوان پہلی بار ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، اس عربی ترجمہ کا پھر ترکی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس طرح اس کتاب کے ذریعہ عرب دنیا اور اہل ترکستان حضرت اقدس تھانوی کی ذات اور ان کی تجدیدی تعلیمات سے روشناس اور فیض یاب ہوئے ـــــ اس عربی کتاب کی ضخامت (۲۵۰) صفحے ہیں۔

۳۔ تجدید معاشیات:۔ یہ کتاب (۱۵۸) صفحات میں تمام ہوئی ہے۔ یہ "فن معاشیات" کی کتاب نہیں بلکہ اس میں جدید معیشت اور ایمانی یا مادی معیشت کے فرق کی وضاحت کے ساتھ اس طور طریق کی وضاحت کی گئی جس پر ایک مسلم فرد اور جماعت اپنی معیشت کو قائم کر کے اس دنیا اور آخرت کے تسلسلِ حیات میں تامتر کامیابی ہی کامیابی حاصل کر سکتی ہے، مولانا گو ماہر معاشیات نہیں لیکن ایک ماہر فلسفی ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہ نے یہاں بھی ایسے نکتے پیدا کئے ہیں کہ اہل فن ان کو پڑھ کر وجد میں آجائیں مثلاً "مال کے بجائے مآل" کی ذیلی سرخی لگا کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ کہ معاشیات جس 'علم المال' کا نام ہے، آپ نے دیکھا کہ اس مال کی طلب و تحصیل کی ترغیب و تحسین کے بجائے اسلام کی کتاب کا اصل زور اس کے مفاسد اور خرابیوں کی تنبیہ پر ہے اور ترغیب و تحسین مال کے مقابلہ میں کم و بیش ہر جگہ مآل یا آخرت کی طلب و تحصیل پر ہے، اس کے بالکل برعکس عہد حاضر کی معاشی تعلیمات اور دعوتوں کا ماحصل انسان کو خدا اور آخرت سے پھیر کر تامتر بندۂ شکم بنانا ہے۔"[1]

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

"علم المال کی دو بڑی بحثیں (۱) مال کا کسب و حصول اور (۲) اس کا استعمال و انفاق" اس میں جدید معاشیات کا سارا زور کسب پر ہے جب کہ "اسلامی معاشیات کہنا چاہئے کہ تامتر انفاقی معیشت کا نام ہے"۔[2]

[1] تجدید معاشیات صفحہ ۹۶، [2] ایضاً صفحہ ۱۰۷

"کسبی معیشت" اور "انفاقی معیشت" کے مفہوم و منشا کو پھر خوب واضح فرمایا اور بتلایا ہے کہ "انفاقی معیشت" ہی فلاح دارین کی ضامن ہے، اس ضمن میں حضرت تھانویؒ کی تلقینات سے خوب شہادتیں پیش کی ہیں۔

۴۔ **تجدید تعلیم و تبلیغ**: یہ کتاب تقریباً (۳۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جدید فلسفۂ تعلیم کی بنیادی خرابی اور اسلامی نظریۂ تعلیم کی خوبی کو واضح کرتے ہوئے جدید و قدیم نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ استدلال و استشہاد تمامتر مجدد ملت حضرت تھانویؒ ہی کے ارشادات سے کیا گیا ہے، البتہ مقدمہ میں خود مولانا کے عجیب نکات ملتے ہیں مثلاً

"تعلیم جدید کا تقاضا (مع پنڈطلب) اپنے بے آغاز و بے انجام تصور تعلیم کی رو سے قدرۃً صرف نفسانی و حیوانی زندگی کی لذت و مسرت، اور جاہ و مال کے امین ہی تلاش کرنے پر مجبور ہے"[1]

اس کی حماقت سامانی کو آگے اس طرح واضح فرمایا ہے:

"انسان کی اپنی یا روحانی فطرت غیر مطلق و بقائے دوام اور نامحدودیت کی طالب ہے ..... لیکن کائنات کی ساخت ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں کی ہر شے محدود و فانی اور ہر چیز کے ساتھ شر توام ہے جو خود اس بات کی فطری دلیل ہے کہ انسان کی یہ زندگی کسی اور زندگی کی طالب ہے جہاں ... جو یہ چاہے وہ ہو[2] جب مطلوب قلیل و محدود اور طالب کثیر و نامحدود ہو تو اہل طلب میں رقابت و مخاصمت ناگزیر ہے۔۔۔ اس راستہ پر چل کر بالآخر اگر ساری زمین قومی و بین الاقوامی کارزار کا میدان بن گئی تو تاسف جتنا بھی ہو لیکن تعجب کی کیا بات ہے[3]"

آگے خاتمہ بحث کے طور پر فرماتے ہیں:

"ہمارے موجودہ انفرادی و اجتماعی مصائب و مفاسد میں سب سے زیادہ حصہ اس موجودہ نظام تعلیم ہی کا ہے

۱۔ تجدید تعلیم و تبلیغ صفحہ ۲۔ ایضاً صفحہ ۱۰ ۳۔ ایضاً صفحہ ۱۲

جس نے خدا و آخرت کی مطلوبیت و مقصودیت کو عملاً زندگی سے خارج کر کے صرف جاہ و مال، حکومت و تجارت اور نفسانی و حیوانی لذت و راحت کو انسان کا مطمح نظر اور مبلغ پرواز بنا دیا ہے"[1]

اس قیمتی مقدمہ کے بعد پوری کتاب میں حکیم الامتؒ کے تجدیدی و اصلاحی اصول و نصاب تعلیم کی تشریح فرما دی گئی ہے۔ کاش آج کے ماہرین تعلیم اس سے مستفید ہوں۔

۵۔ **تجدید کلامیات**: سلسلۂ تجدید کی یہ آخری اور اہم ترین کڑی ہے، اس اعتبار سے بھی کہ "کلامیات" مولانا کا خاص موضوع تھا اور اس جہت سے بھی کہ جدید علم کلام وقت کا مطالبہ ہے۔ یہ تصنیف مولانا نے مکمل فرما لی تھی مگر چھپ نہ سکی تھی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کے ایک مکرمت نامہ میں مولانا نے اس عاجز کو تحریر فرمایا تھا:

"اگر آپ سے چند ماہ بھی قریب کا کوئی صورت نکل سکتی کہ میں ساری کسی طرح سفر کر کے اور آپ کے پاس یا آپ کے قریب قیام کرتا اور کم از کم تجدید کلامیات کے سیکڑوں صفحات کی نظر ثانی آپ سے کراتا ..... مجھ کو بہ اپنی حد تک معنوی اعتبار سے تو کچھ زیادہ اپنی تحریروں سے بے اطمینانی نہیں ہے لیکن تعبیری حیثیت سے کچھ آپ ہی کے سے بے تکلف دوست کو نقطہ نقطہ نظر ثانی کی زحمت دینے کا جی چاہتا ہے"

یہ مولانا کی قدر افزائی و ذرہ نوازی تھی، افسوس اس کا ہے کہ یہ تصنیف غیر مطبوعہ رہ گئی۔

تجدیدی تصانیف کا اسلوب | تجدیدی تصانیف میں مولانا کا اسلوب نگارش وہ نہیں جو ان کی فلسفیانہ تصانیف کا ہے یعنی ان میں جدید نفسیات اور فلسفہ سے تقابل کے ساتھ حضرت اقدس تھانویؒ کے گہرے نفسیاتی اور فلسفیانہ افکار کو آشکار نہیں کیا گیا ہے[1] اور تقابلی اظہار میں مولانا کی جو استدلالی زبان اور طرز بیان ہے وہ یہاں نہیں ملتا، راقم عاجز کا خیال ہے کہ اگر مولانا کا عمومی اسلوب ان تصانیف میں بھی قائم رہتا تو نو تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے تجدیدی تصانیف میں زیادہ کشش پیدا ہوتی — دراصل ان تصانیف

۱۔ بعض ماہرین نفسیات کی توجہ اب اس طرف ہوئی ہے اور پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر نفسیات ڈاکٹر محمد اجمل نے حضرت تھانویؒ کے اس پہلو پر کام کیا ہے اور بعض اور اہل علم بھی یہ کام کر رہے ہیں۔

میں مولانا پر حضرت تھانویؒ کی عظمت کا اس قدر غلبہ ہے کہ ان کا اسلوب تحریر تک ان سے متاثر ہو گیا ہے۔

ان تصانیف کا امتیاز

باقی ان تصانیف کا امتیاز یہ ہے کہ حضرت مجدد تھانویؒ کی تعلیمات کا اس قدر مرتب تحلیلی مطالعہ اور ان کے علوم کی اس قدر صحیح تشریح و ترجمانی نہ اس سے قبل کسی نے کی تھی نہ آج تک کسی سے بن آئی ہے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانویؒ کے مسلک و مشرب کو صحیح طور پر سمجھنا ہو تو مولانا عبد الباری ندویؒ کی ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے اور مولانا سید فضل اللہ رحمۃ اللہ علیہ (صاحب "فضل اللہ الصمد فی شرح الادب المفرد" و پروفیسر حدیث جامعہ عثمانیہ) مجھ سے فرماتے تھے کہ مولانا عبد الباری صاحب نے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کو اپنی ان تصانیف میں جس بلندی تک ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اہل علم ہی لگا سکتے ہیں۔

قرآنی خدمات

فلسفہ کے بعد مولانا کو سب سے زیادہ شغف قرآن پاک سے تھا اور بصیرت قرآنی سے انھیں حظ وافر ملا تھا جس کا اندازہ مولانا کے ان ارشادات سے ہوگا، وہ فرماتے تھے کہ مجھے ان تفاسیر سے زیادہ دلچسپی نہیں جو لکھنے والوں نے پورے قرآن پاک کی لکھی ہیں، میں زیادہ شوق اور غور سے وہ جزوی تفاسیری رسائل دیکھتا ہوں جن میں بعض بعض آیات کی تفسیر لکھی ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر غور و فکر کرنے والے پر قرآن کا کوئی کوئی مقام ہی کھلتا ہے اور وہی اس کی یافت کا حاصل ہوتا ہے۔

کراچی کے دوران قیام، جب میرا غریب خانہ ہی مولانا کا فرودگاہ تھا، صبح کی نشست میں مجھ سے فرمانے لگے دیکھئے یہ مادی کائنات کتنی محدود ہے اور انسان اس کے خزائن کی تلاش میں صدیوں سے لگا ہوا ہے مگر آج بھی اس کی دریافت نئی نئی چیزیں نکال ہی رہی ہے اور یہ دریافت ناختم ہی معلوم ہوتی ہے، تو قرآن پاک تو "معنوی کائنات" ہے اس کے غوامض اور اس کے رموز و اسرار کا احاطہ انسانی دسترس میں کیسے آسکتا ہے؟ یہ تو ایک بے پایاں سمندر ہے جس کی غوطہ زنی سے کسی کو

کوئی گوہر ہاتھ آجائے تو وہی اس کی زیست کا حاصل ہے۔

جو حمائل شریف مولانا کی روزانہ تلاوت میں رہتی تھی، اس پر مولانا نے جابجا اپنے قلم سے اشارات لکھے تھے، خیال تھا کہ فرصت پاکر ان کی تشریح لکھیں گے مگر بیماری کا سلسلہ اس قدر طول کھینچ گیا اور نقاہت اتنی بڑھی کہ لکھنے کی تاب باقی نہ رہی۔ مجھے لکھا کہ دو ماہ کی فرصت نکال کر لکھنؤ پہنچوں اور مولانا کا مہمان بن کر اور مولانا کے منشاء و مدعا کو سمجھ کر ان قرآنی نکات کی تشریح اپنے قلم سے لکھوں، مگر افسوس صد افسوس کہ میں اس مبارک سفر سے عاجز رہا، پھر مولانا نے ارادہ فرمایا کہ وہ حمائل شریف میرے پاس بھیج دیں گے مگر مجھے اس کا انتظار ہی رہا، جب میں نے اس کی یاد دہانی کا عریضہ لکھا تو جواب آیا:-

"جس حمائل شریف کا آپ نے ہمارے مولانا دریابادی کے واسطہ سے ذکر کیا ہے وہ سرمست تجبگ کلامیات قرآن حق تعالیٰ پورا انہیں فرما دیتے ہیں خود مجھ کو کبھی کبھی اس کو دیکھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے ورنہ وہ کیا میں تو اور بھی خدا جانے کتنی چیزیں جو ناقص و ناتمام پڑی ہیں سب ہی آپ کے حوالے کر دیتا کہ میرے علم و تعلق میں آپ سے بہتر کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو ماشاء اللہ آپ کی طرح جواں ہمت و جواں قلم ہو۔ سب تو نہیں شاید بعض چیزیں آپ کے مذاق کی نکل آتیں اور آپ ان سے جو چاہتے کام لے سکتے تھے" (مکتوب مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۶ء)

بہرکیف پھر وہ حمائل شریف راقم الحروف تک نہ پہنچ سکی، اللہ کرے محفوظ ہو۔

مولانا کے ہاتھوں دو قرآنی خدمات پھر بھی انجام پاگئیں جن میں سے ایک چھپ کر خوب مقبول ہوئی اور دوسری چھپ نہ سکی، ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) **نظام صلاح و اصلاح**: اس کا پورا عنوان ہے "قرآن کا دو آیاتی نظام صلاح و اصلاح"[1]

---

[1] یہ دراصل مولانا کا ایک مسلسل قسط وار شائع شدہ مضمون ہے، راقم الحروف کو بہت پسند آیا تو مولانا کی تحریک کے بغیر میں نے اس کو مرتب کرکے اس کی عنوان بندی اور کہیں کہیں حواشی لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھیج دیا تھا کہ پسند خاطر ہو تو یہ کتابی صورت میں مجلس علمی (کراچی) سے چھپ جائے۔ مولانا نے اس خدمت کو بیحد سراہا اور دعائیں دیں جو میرے لیے ذریعۂ آخرت ہیں۔

یہ دراصل سورۂ والعصر کی تفسیر ہے اور پورے بسط کے ساتھ اس کے مضامین کی تشریح بھی ہے تذکیر بھی ہے اور اس میں ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اجزاء سے ایک مکمل نظام صلاح و اصلاح مرتب کر دیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس سے علمی فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ مولانا کی قرآنی بصیرت ان کی اصلاح ملت کے سوز دروں اور ان کی حکیمانہ نظر کا جامع مرقع ہے، اس کے متعلق مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا کہ مولانا نے اپنی اس گرانقدر پیشکش سے "تمام علماء اور خادمان دین کو عبرت آموز سبق دیا"۔ نیز لکھا کہ "مولانا قرآنی حقائق کے ذوق میں بے مثل تھے"۔ (ماہنامہ بینات کراچی اپریل ۷۶ء)

یہ کتاب مجلس علمی (کراچی) سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی اور عام کتابی سائز کے ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے

(۲) **کلامیات قرآن**:۔ تجدید کلامیات کی طرح کلامیات قرآن بھی مولانا کی بڑی گرانقدر تصنیف ہوتی بلکہ اس کا درجہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا، کیا بہ اعتبار اہمیت کے اور کیا بہ اعتبار افادیت کے مگر قضا و قدر کا فیصلہ نہیں تھا کہ یہ تصنیف مولانا کے ہاتھوں مکمل ہوتی۔ نا تمام رہ گئی، اس کا ایک سبب غالباً مذہب و سائنس کی تکمیل کا انہماک رہا۔ ۶؍ اگست ۱۹۶۹ء کے کرم نامے میں تحریر فرماتے ہیں

ان کی (یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی) رائے یہ ہے کہ اس حصہ (یعنی "مذہب و سائنس") کو کلامیات قرآن کی تکمیل تک روکا نہ جائے"۔

اب یہ بھی معلوم نہیں کہ کلامیات قرآن کے عنوان سے کتنے صفحات تحریر فرمائے گئے تھے اور وہ کہیں محفوظ بھی ہیں یا نہیں، قیاس یہ ہے کہ قابل لحاظ حصہ ضرور تحریر پا چکا ہوگا۔

آخری گزارش | استاذ الاساتذہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے خاص شاگردوں میں حضرت مولانا عبدالباری ندوی کی ذات عظیم فلسفیانہ اور صوفیانہ جامعیت میں بالکل منفرد تھی اور مولانا کا حق ہندوستان کے تین مشہور علمی اداروں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)، دارالمصنفین (اعظم گڈھ) اور جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) پر برابر کا عائد ہے، اول الذکر دونوں ادارے بحمداللہ اب تک باقی ہیں اگر ان کی توجہ سے حضرت مولانا مرحوم کی غیر مطبوعہ مکمل اور نا تمام تصنیفات ہی طبع ہو کر منظر عام پر آ جائیں تو ایک قیمتی علمی سرمایہ تلف ہونے سے بچ جائے۔ وما علینا الا البلاغ

تحریک رابطۂ قلمیہ کا تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا

(۲)

اندلسی موشحات کا اثر | ان ادباء و شعراء نے ایک نئی زبان اور نیا انداز تعبیر پیش کیا ہے جس پر مغربی زبان کا پرتو اور امریکی ادب کا اثر ہے۔ ان کی شاعری میں اندلس کے موشحات کا رنگ نظر آتا ہے، درحقیقت اتنا بڑا ادبی انقلاب عربی ادب کی تاریخ میں اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اندلس میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے موشحات کو اپنا مثالی نمونہ تصور کیا اور اندلس کا ذکر بھی اپنی شاعری میں شروع کر دیا، رابطہ قلمیہ کے بعد جو تحریک اٹھی اس کا نام ہی (العصبة الاندلسية) اندلسی جماعت رکھا گیا۔

اوزان و بحور میں تبدیلی | مہجری شعراء نے اندلس کے موشحات کو غیر معمولی اہمیت دینے کے باوجود انھوں نے اس کے وزن اور اس کی بحروں کو بدل دیا اور اس کو مختلف انداز سے نئے طریقہ سے نظم کیا۔ اپنے شوق وطن کو موشحات میں کھل کر پیش کیا مگر اوزان میں انھوں نے عربی ہی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ انگریزی، فرانسیسی، روسی اور امریکی شاعری کے انداز سے بھی بہت کچھ اخذ کیا۔ انھوں نے شعر کے اوزان میں غیر معمولی انقلاب پیدا کیا جو کہ ایک بہت اہم اور بڑا مشکل مسئلہ تھا اور حق یہ ہے کہ عصر جاہلی سے عصر عثمانی تک عربی شاعری کی بحور میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ان شعراء نے نہ صرف بحروں میں اور اوزان میں تبدیلیاں کیں بلکہ قافیوں تک میں تجدید اور تبدیلی کر دی۔ میخائیل نعیمہ نے صاف اعلان کیا کہ:۔

وإن القافية العربية	عربی قافیہ جو آج تک جاری اور غالب
السائدة إلى اليوم ليست	ہے وہ ایک آہنی بندھن کے سوا کچھ
سوى قيد من حديد	نہیں جو ہمارے شعراء کی طبیعتوں کو باندھتا
يربط قرائح شعرائنا	ہے ایک زمانہ سے اس کو توڑ کر پھینک
وقد حان تحطيمه	دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، اس
من زمان"[1]	کا وقت آچکا ہے۔

ان شعراء نے یہ طریقہ اپنایا کہ ایک وزن اور ایک قافیہ شروع کیا، دو تین شعر اس انداز سے کہے پھر وزن و قافیہ بدل دیا اس کے بعد چند شعر کہے پھر پہلے والا قافیہ دوبارہ اختیار کر لیا اور کسی کی قسم کی کوئی پابندی اپنے اوپر لازم نہیں کی۔ انھوں نے ایسا بھی کیا ہے کہ قصیدہ کو وحدتوں میں بانٹ دیا ہے، ہر وحدت کا قافیہ دوسرے سے مختلف ہے، پہلے گزرے ہوئے قافیوں کو دوبارہ بھی استعمال کر لیا ہے۔ وہ کبھی ایسا بھی کرتے ہیں کہ ہر شعر کا قافیہ بدل دیتے ہیں جیسا کہ فارسی اور اردو میں مثنوی کا اصول ہے۔

یہ شعراء رباعیات کے شوقین تھے، انھوں نے رباعیات عمر خیّام کے وزن پر عربی میں رباعیاں بھی نظم کی ہیں مگر عربی زبان کا مزاج رباعی پسند نہیں معلوم ہوتا اس بنا پر اس طریقہ کو زیادہ رواج نہ ملا

مہجری شاعری میں شعریت و غنائیت

یہاں یہ امر بھی قابل التفات ہے کہ مہجری شاعری نئے تجربات، تجدد، بحر و قافیہ کی تبدیلی اور وزن سے قدرے بے نیازی کے باوجود شعریت سے پُر نظر آتی ہے، اس میں موسیقی کی لذّت اور قافیہ کی دلکشی اور وزن کا احساس ہلکے انداز سے

---

[1] الغربال ص [illegible]

محسوس ہوتا ہے۔ یہ اشعار سہل اور رواں ہیں۔ ایسے شیریں، فصیح اور دلکش الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو دل میں گھر کر لیں۔ انہوں نے معروف کلمات و الفاظ کو دلکشی سے استعمال کیا ہے۔ انگریزی کے بعض الفاظ کا استعمال ان کے یہاں اس طرح ملتا ہے جیسے کہ وہ عربی کے الفاظ ہوں۔ اگرچہ اب یہ طریقہ عام ہو گیا ہے مگر اس دور میں یہ انداز تعریب انوکھا ضرور تھا۔ ان کے الفاظ و تراکیب حسنِ ذوق اور مکمل شعریت کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کے یہاں غنائیت پوری طرح پائی جاتی ہے جو شاعری کی روح ہے۔

قصصی شاعری

عربی شاعری میں ایک نئی طرز کی شاعری کا آغاز ان شعراء نے بڑی کامیابی سے کیا ہے یعنی قصصی شاعری۔ ان کے یہاں قصصی شاعری ترقی یافتہ انداز میں ملتی ہے، جب کہ قدماء کے یہاں اس طرز شاعری کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ان کے یہاں مکالمے بھی ہیں، کبھی دو افراد کے درمیان اور کبھی تین اشخاص کے درمیان۔ مکالمہ نگاری ایک مشکل عمل ہے خصوصاً شاعری میں۔ مگر شعرائے مہجر نے کامیابی سے اس صنف کو پروان چڑھایا ہے، حق یہ ہے کہ پوری عربی شاعری میں قصصی شاعری ترقی یافتہ نہ تھی لیکن ان مہاجر شعراء نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر منثور

ان شعراء نے شعر منثور کا بھی تجربہ کیا۔ امین ریحانی لکھتے ہیں کہ انگریزی اور فرانسیسی میں اس طرز کی شاعری موجود ہے۔ ان نظموں میں ایک مخصوص و متنوع انداز کا وزن ہوتا ہے جس کا کوئی تعلق اشعار کے معروف اصولوں سے نہیں ہوتا۔ ان نظموں میں فلسفیانہ انداز نظر، معاشرتی زندگی کی تصویریں اور حکیمانہ اقوال نظم کئے جاتے ہیں۔ امین ریحانی اس طرز شاعری کے ایک بڑے ترجمان تھے مگر جبران اور دوسرے شعراء نے بھی شعر منثور کہنے کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر نسیب عریضہ کا نثری قصیدہ پیش کیا جاتا ہے:۔

کفنوه اس کو کفن پہناؤ

وادفنوه اس کو دفن کر دو

اسکنوه اس کو رکھ دو

هوة اللحد العميق قبر کے گہرے گڈھے میں

واذهبوا لا تندبوه فهو شعب جاؤ نوحہ خوانی مت کر دو

ميت ليس يفيق اس لئے کہ وہ ایسی مردہ قوم ہے جو بیدار نہ ہوگی

رشید ایوب نے کثرت سے اس طرز کی نظمیں لکھی ہیں، خصوصًا ان کا مجموعۂ کلام "اغانی الدرویش" اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔

لفظی اختراع جہاں تک الفاظ کا سوال ہے تو ان شعراء نے نئے نئے الفاظ گڑھے اور ڈھالے ہیں؛ انھوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو اس سے قبل عربوں نے استعمال نہ کئے تھے مگر اس کے باوجود یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے عامیہ کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ اپنا ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لئے عامیہ سے استفادہ کیا جیسا کہ عام عرب ادباء کرتے ہیں۔

ان کی شاعری میں نفس انسانی کو متحرک و متاثر کرنے کی جو طاقت ہے اس کی وجہ سے ڈاکٹر محمد مندور نے مہجری شاعری کو "الشعر المهموس" (کانا پھوسی کرنے والا شعر) کہا ہے اور همس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایسا احساس جس کو زبان اور عناصر ادب پیدا کرتے ہیں اور جو نفس کو متاثر کر کے اس میں سکون کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

اس طرز کی عمدہ نظم "اوراق الخريف" ہے جو میخائیل نعیمہ کی ہے، انھوں نے اپنے دیوان کا نام همس الجفون رکھا ہے اور جورج صیدح کا ایک دیوان "همس الشاعر" کے نام سے مشہور ہے۔ همس الجفون کے معنی ہیں پلکوں کی آہستہ کلامی اور همس الشاعر کا مطلب ہے شاعر کی کانا پھوسی۔

اسی انداز کی رشید ایوب کی نظم "المسافر" بھی ہے۔

حیات و کائنات کے مسائل کی عکاسی یہ شعراء چیخ پکار سے الگ رہ کر زندگی کا سنجیدہ اور گہرا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نسیب عریضہ کا مندرجہ ذیل قصیدہ ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

من الالحان لا ادری سوى انشودة الصبر

سوائے نغمۂ صبر کے میں گیتوں میں سے کچھ نہیں جانتا۔

اغنيها من القهر لطفل بات جوعانا

میں اس بچے پر ظلم کے نغموں کو گاتا ہوں جو رات کو بھوکا سو رہا۔

ملاك الرب فى الحلم يناجي الطفل كالام

خدا کا فرشتہ خواب میں بچے سے سرگوشی کرتا ہے ماں کی طرح۔

يناديه من النجم الا نم وقتنا حانا

وہ اس کو ستاروں سے پکارتا ہے کہ سونے کا وقت آچکا ہے سو جا۔

يناجيه باايام سيأتى خيرها طامى

وہ اس سے ان دنوں کی باتیں کرتا ہے جن کا خیر منقریب کثرت سے آئے گا۔

سيروى ماؤها الظامى ويشفى النور عميانا

جس سے پیاسا سیراب ہو جائے گا اور جس کی روشنی اندھے کو بینا کر دے گی۔

ظلام الليل قد اطبق فنم يا طفل لا تقلق

رات کی تاریکی چھا چکی ہے سو جا اے بچے مضطرب نہ ہو۔[1]

يعود النور والرونق اذا ما الله ابقانا

---

[1] قصۃ الادب المہجری ص ۱۵۵-۱۵۶

نور اور رونق آئے گی جب خدا کو ہماری بقا منظور ہوگی۔

خلیل جبران نے بڑے ادبی انداز سے اپنے افکار ایک مضمون میں پیش کیے ہیں جس کا عنوان ہے "لکم فکرکم ولی فکرتی"

لكم فكركم شجرة صلبة	تمہارا طرز فکر ایک ایسا سنگلاخ درخت
تتمسك عروقها بتربة	ہے جس کی جڑیں تقلید کی مٹی میں پیوست
التقاليد وتنمو فروعها	ہیں اور جس کی شاخیں تسلسل کی طاقت سے
بقوة الاستمرار ولي فكرتي	نمو پذیر ہیں لیکن میرا فکر ایک ایسا بادل
سحابة تتهادى في الفضاء	ہے جو فضا پر قائم ہے پھر قطرے بن کر
ثم تهبط قطرات ثم تسير	زمین پر آتا ہے پھر نہر بن کر سمندر کی طرف
جدولاً الى البحر ثم تتصاعد	چلتا ہے پھر بادل بن کر اوپر چڑھتا ہے
ضبابا نحو الاعالي	اور بلندیوں کی طرف جاتا ہے۔
لكم فكركم برجاً متيناً	تمہارا طرز فکر ایک ایسا محکم برج ہے جس کو
راسخا لا تهزه الانواء	بارش ہلا نہیں سکتی اور طوفان حرکت نہیں
ولا تحركه العواصف ولي	دے سکتے لیکن میری فکر نرم گھاس
فكرتي اعشاباً لينة تميل	ہے جو ہر طرف مائل ہوتی ہے اور
الى كل ناحية وتجد بميلها	لچکدار ہونے کے باعث نور و
بهجة وسروراً	سرور پاتی ہے۔
لكم فكركم مذهباً قديماً	تمہارا فکر ایک قدیم طریقہ ہے جو نہ تم کو
لا يغيركم ولا يتغير و	بدلتا ہے اور نہ خود متغیر ہوتا ہے، لیکن

لي فكرتي بدعة جديدة	میرا فکر جدت پسندی ہے جس کو میں
اغربلها وتغربلني كل صباح	خوب چھانتا ہوں اور وہ مجھ کو ہر صبح
ومساء	وشام چھانتی ہے۔
لكم من فكركم ان يصرعكم	تمہارا فکر یہ ہے کہ تمہارے کمزور کو
ضعيفكم ويحتال داهيتكم	قوی پچھاڑ دیتا ہے اور تمہارے اندر
على ساذجكم ولي فكرتي	چالاک سادہ لوگوں کو دھوکہ دیتے
ان احرث الارض بمعولي و	ہیں مگر میرا فکر یہ ہے کہ میں زمین کو
استثمرها بمنجلي وان ابني	ہل سے جوتوں اور اس کے پھل اپنی
بيتاً من الحجارة والطين	ہنسیا سے کاٹوں، ایک گھر پتھر اور مٹی
واحوك ثوبا من	سے بناؤں اور اون یا ریشم سے
الصوف او الكتان	کچھ کپڑے بنوں۔

میں نے یہ اقتباس اس بنا پر پیش کیا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان ادبا کا انداز نظر کیا تھا۔ یہ عبارت اس انداز تعبیر کی بھی ترجمانی کرتی ہے جو "جبرانی بلاغت" کہلاتا ہے۔ یہ وہ رنگ ہے جس میں تمام ادبائے مہجر رنگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے خلیل جبران کے انداز فکر کو اپنایا ہے اور اس فکر نے ان کی ادبی کاوشوں میں رنگ بھرا ہے۔ انھوں نے روایت و تقلید کے بندھن توڑے ہیں۔ مشاہدات، تجربات اور فطرت سے کسب فیض کیا ہے۔ اپنی شخصیت اور انانیت کو نمایاں کیا ہے۔ اسلوب میں نئے تجربات کیے ہیں۔ اعلیٰ انسانی قدروں کو نمایاں کیا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں فکر و تأمل سے کام لیا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے جمال پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے ذاتی حالات کی بنا پر حبِ وطن کے نغمے گائے ہیں

سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے حریت پسندی اختیار کی ہے۔ ظاہر ہے کہ روایت سے انحراف بغیر آزادیٔ خیال کے ممکن نہیں۔ انھوں نے معاشرہ پر تنقیدیں کی ہیں۔ مذہبی اور سیاسی استحصال پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اپنے فن کو فطرت کے جمال و جلال سے منور و مصور کیا ہے۔

مہجری ادب کے اثرات

ظاہر ہے کہ ایسی فکر انگیز تحریک کے اثرات محدود نہیں رہ سکتے، چنانچہ شرق و شرق دونوں پر اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مصطفےٰ لطفی منفلوطی کا اسلوب مہجری نثر سے متاثر ہوا ہے۔ مثلاً وہ "سعادت" پر اس طرز سے گہر فشانی کرتے ہیں[1]:

اطلب السعادۃ فی الحقول و	کھیتوں اور باغوں میں، پہاڑوں اور
الغابات و السہول و الجبال	وادیوں میں، پودوں اور درختوں میں
و الاغراس و الاشجار و	پتیوں اور پھلوں میں، چھوٹے سمندروں
الاوراق و الاثمار و البحیرات	اور دریاؤں میں، سورج کے طلوع و غروب
و الانہار و فی منظر الشمس	کے منظر میں، بادلوں کے اجتماع و
طالعۃ و غاربۃ و السحب	تفریق میں، چڑیوں کی صبح و شام آمد
مجتمعۃ و متفرقۃ و الطیر	رفت میں اور ستاروں کے قیام و
غادیۃ و رائحۃ و النجوم	سیر میں تم کو سعادت تلاش
ثابتۃ و سابحۃ	کرنی چاہئے۔

اگرچہ یہ انداز مہجری ادیبوں کا ہے مگر راقم عبد المنعم خفاجی کی مذکورہ رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ منفلوطی کا اپنا اسلوب ہے جو دہی ہے ممکن ہے کہ جبران سے انھوں نے تاثر قبول کیا ہو مگر ان کے اسلوب کی خصوصیات مہجری رنگ سے مختلف ہیں، وہ قدما کی پیروی کرتے ہیں نیز بیان الفاظ

---

[1] قصۃ الادب المہجری ص ۱۵۰

بھی استعمال کرتے ہیں، رہ گیا فطرت کے حسن سے استفادہ تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مہجری ادب سے تاثر کا نتیجہ ہو، عام رومانیت پسند ادب کا ایک اہم عنصر فطرت پسندی بھی ہے۔ خود خفاجی نے حاشیہ میں اس نظریہ پر شبہ ظاہر کیا ہے[1]۔

لبنان پر اس ادب کے اثرات بہت گہرے پڑے، اس لئے کہ مہجری ادبا سب لبنانی تھے۔ شام میں آزاد پسند طبقہ نے تاثر قبول کیا۔ عراق و فلسطین پر بھی اس نے دور رس اثرات مرتب کئے مگر مصریوں نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے جبران کے شعر و ادب میں لغوی غلطیاں نکالیں۔ انہوں نے ابو ماضی کے اشعار میں اسلوب زبان اور تخیل میں تجاوز و انحراف کی کیفیت محسوس کی۔ بعضوں نے کہا کہ یہ ادب اسلامی تہذیب میں اجنبیت و غربت کا ترجمان ہے اگرچہ ڈاکٹر محمد مندور اور محمود عباس عقاد نے اس کو بہ نظر استحسان دیکھا۔

الجزائر اور حجاز میں بھی شعراء نے اس سے تاثر قبول کیا، بعض شعراء نے اپنے دواوین کے نام اس طرح رکھے:۔ ہمسات[1]، احلام الربیع[2]، انفاس الربیع[3]، یعنی کانا پھوسی، بہار کے خواب[2]، بہار کی سانسیں[3] جو واضح طور پر مہجری تحریک کے اثرات ہیں۔

شمالی امریکہ میں جبران، رشید ایوب، نسیب عریضہ، ایلیا ابو ماضی اور میخائیل نعیمہ نے اور جنوبی امریکہ میں الیاس فرحات، ابو الفضل ولید، نعمہ قازان، فوزی معلوف اور رشید خوری قروی نے اس امر کی جد و جہد کی کہ عربی ادب کو ان تمام قیود سے آزاد کر دیں جن میں وہ صدیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ انھوں نے الفاظ کی اہمیت کو کم کیا اور معانی کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے قدیم ادب اور قدیم شاعری پر پوری طرح حملہ کیا۔ انھوں نے ان تمام موضوعات کو خیرباد کہا جو قدیم زمانہ میں رائج تھے جیسے مدح، ہجو، فخر اور تہنیت وغیرہ۔ ان شعراء نے

---

[1] قصۃ الادب المہجری ص ۱۵۸، [2] ایضاً ص ۱۵۸، ۱۵۶، ۱۶۰

نفس انسانی کو شاعری کا مصدر اور موضوع قرار دیا، یعنی نفس کے اندر پوشیدہ احساسات کی ترجمانی کی۔ انسانی رنج و غم، یاس و قنوط، مسرت و شادمانی، حسرت و ناکامی، شکست و حرماں نصیبی غرض اس طرح کے ہزاروں مواقع زندگی میں آتے ہیں اور نفس انسانی کے اندر انفعالات پیدا کرتے ہیں۔ یہی تأثرات اور ان کی ترجمانی شاعری کا موضوع ہے۔ ان شعراء نے الفاظ، وزن، صنائع و بدائع اور بحر و قافیہ سے نفرت کا اعلان کیا۔ ان کو شعر سے الگ ایک خارجی عنصر قرار دیا۔ ایلیا ابو ماضی وضاحت سے اپنی ایک نظم میں کہتا ہے جو اس کے دیوان "الجداول" میں شامل ہے کہ:-

لست مني ان حسبت الشـ عر الفاظا ووزنا

تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اگر تم شعر کو الفاظ و وزن میں محصور سمجھتے ہو۔

خالفت دربك دربي وانقضى ما كان منا

تمہارے راستے نے میرے راستے کی مخالفت کی اور میرا تعلق تم سے منقطع ہو چکا۔

فانطلق عني لئلا تقتني همًّا وحزنا

تو تم میرے پاس سے ہٹ جاؤ تاکہ تم مجھے غم نہ دو۔

واتخذ غيري رفيقاً وسوى دنياي مغنى

اور تم میرے علاوہ کسی دوسرے کو ساتھی بنا لو میری دنیا کے علاوہ بھی تمہارے لئے بہت کچھ ہے۔

ہجری ادب میں شعری عیوب کے اسباب اور اس کی خصوصیات

عرب ناقدوں نے ان مہاجر ادباء کے خلاف ایک جنگ چھیڑ دی۔ اس لئے کہ وزن و قافیہ سے بے تعلقی کے باعث ان کے یہاں شعری عیوب پیدا ہو گئے۔ ان کی زبان میں نحو و صرف اور لغت کی ایسی غلطیاں ظاہر ہوئیں جو مصری ادباء برداشت

نہ کر سکے۔ دراصل ناقدوں نے تنقید میں حد سے تجاوز کیا۔ ان کا یہ غرض نہ تھا کہ وہ دوسروں پہ کیچڑ اچھالیں۔ ان مہاجر ادباء نے ایک نئی راہ اختیار کی تھی، اس میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں، خاص طور سے غلطیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ عربی زبان کے مرکز سے دور تھے عربی زبان کے الفاظ مصادر اور مراجع ان کے ساختہ نہ تھے۔ ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ قدیم زبان جس میں رکاوٹ جمود اور تعفن پیدا ہو گیا تھا اس کو ترک کر کے مغربی ادب کے چشمۂ فیاض سے اپنی زبان کو ایک نیا رخ اور ایک نئی زندگی عطا کریں۔ انھوں نے وہی موقف عربی میں اختیار کیا، جو انگریزی ادب میں رومان پسندوں نے کلاسیکی شاعری کے خلاف اپنایا تھا۔ رومان پسند شعراء نے قدیم شعراء کی پابندیوں کو خیرباد کہا، وزن و قافیہ چھوڑ کر انھوں نے فطرت کی آغوش میں پناہ لی۔ جنگلوں، کھیتوں، باغوں اور دیہاتوں میں حسن و نور کی دولت تلاش کرنے لگے۔ بالکل یہی عالم ہم کو ان ہجری شعراء کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہ ادب کو اپنی ذات کا مظہر تصور کرتے ہیں، انھوں نے شہری زندگی پر ضرب کاری لگائی ہے، یہ فطرت کے متلاشی ہیں، یہ سادگی اور صداقت اور حسن فطرت کے شائق ہیں، مشینوں کی زندگی سے انھیں نفرت ہے۔

یہ شعراء تجدد پسند ہیں، انھوں نے اپنے اسالیب میں، زبان میں، اور موضوعات میں تجدد کی راہ اختیار کی، ہیئت کے نئے طریقے اپنائے، شعری قالب بدلے مگر فکری طور پر بھی ان کے یہاں ایک ایسا فلسفۂ حیات ملتا ہے جو خیر و شر اور کشمکش حیات کا ترجمان ہے۔ البتہ وہ ادب و شاعری جو ان ادیبوں نے جنم دیا ہے اس کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے ہم کو وہ پیمانہ استعمال نہیں کرنا چاہیے جس سے ہم بحتری، ابو تمام، متنبی اور دور عباسی کے دوسرے شعراء کو ناپتے ہیں، کلاسیکی پیمانے ان کی شاعری یا ان کے ادب کو ناپنے اور ان کی قیمت متعین کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ رابطۂ قلمیہ نے جو عظیم ادبی سرمایہ پیدا کیا ہے اس نے ادبی دنیا میں انقلاب

برپا کیا ہے۔ جو طویل قصیدے یادگار چھوڑے ہیں، ہلکے پھلکے اوزان میں اور رواں زبان میں جو شاعری کی ہے اس کے لئے جدید ذوق اور جدید ذہن کی ضرورت ہے اس لئے کہ ان شعراء نے آزادی اور نیا انداز نظر اختیار کیا ہے لیکن ہمارے ناقدوں نے اس ادب کے بارے میں مخالفانہ رویہ اختیار کیا ہے، اس لئے کہ یہ ان کے ذوق نظر سے مختلف ہے، بے شک اس مہجری ادب کے بارے میں اختلافات ہیں مگر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس شعری اور نثری سرمایہ کا جائزہ ژرف نگاہی سے لیا جائے تو مشرقی روح ایک نئے لباس میں نظر آئے گی، عربیت ان شعراء کا سب سے بڑا سرمایہ ہے[1]۔ اس ادب میں اصل جوہر یہی ہے جو قدیم ادبی سرمایہ سے اختلافات کے باوجود ان کو جوڑتا ہے جب کہ تحریک رابطۂ قلمیہ اپنا رشتہ قصیدۃ النفس مصنفہ ابن سینا سے جوڑتی ہے۔

تحریک رابطۂ قلمیہ کے مقاصد

خلیل جبران خلیل جو تحریک رابطۂ قلمیہ کے اصل بانی ہیں انھوں نے زبان و بیان اور فن و فکر کے بارے میں وضاحت سے اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کردی ہے، ان کے بیان کو پڑھنے کے بعد پھر کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آنا چاہئے کہ وہ ادب جو اسی زمانہ میں مصر میں پروان چڑھ رہا تھا اس میں اور اس ادب میں جو امریکہ میں نشو و نما کے مراحل سے گزر رہا تھا دونوں میں غیر معمولی فرق و امتیاز کیوں پایا جاتا ہے، اس لئے کہ جبران نے ان کو واضح کر دیا ہے۔ محمود سامی بارودی، احمد شوقی اور حافظ ابراہیم وغیرہ نے عباسی دور کی شاعری کے تانے بانے کو اپنایا اور اس میں دور جدید کے معاملات و وسائل کو سمو کر ایک گنگا جمنی انداز اختیار کیا، اسی بنا پر یہ شعراء "محافظین" کہلاتے ہیں یعنی انھوں نے قدیم روایت کو پوری طرح سے اپنی ادبی کدو کاوش میں ملحوظ رکھا مگر نئے مغربی موضوعات کو بھی

---

[1] دراسات فی الشعر المعاصر از شوقی ضیف، قاہرہ طبع ہفتم ص ۲۴۵ تا ۲۵۳

اپنی شاعری میں جگہ دی اور سماجی ترجمانی کا فرض بھی ادا کیا البتہ انداز فکر اور ہیئت و قالب میں بالکل قدیم وضع پر چلتے رہے، الفاظ، تراکیب، لغت اور اقسام شاعری میں وہ محافظ و مقلد نظر آتے ہیں، اسی پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر خلیل جبران کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے

لکم لغتکم ولی لغتی لکم	تمہارے لئے تمہاری زبان ہے اور
منہا القوامیس والمعجمات	میرے لئے میری زبان، عربی زبان میں
والمطولات، ولی منہ ما	تمہارے لئے لغات اور علم بیان کی ضخیم
بلتہ الأذن وحفظتہ	کتابیں ہیں لیکن میرے لئے وہ زبان
الذاکرۃ من کلام مألوف	ہے جس کو کانوں نے پرکھا ہے اور حافظ
مأنوس تتداولہ	نے یاد رکھا ہے۔ وہ زبان بے حد
ألسنۃ الناس فی أفراحہم	مانوس ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور
وأحزانہم	غمی کے مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔
ولکم منہا الرثاء	تمہارے لئے زبان میں مرثیہ، مدح،
والمدیح والفخر والتہنئۃ	فخر اور تہنیت ہے لیکن میری زبان
ولی منہا ما یتکبر عن رثاء	ایسی ہے کہ اس بچہ کے مرثیہ سے بلند
من مات وہو فی الرحم	ہے جو رحم مادر میں مر گیا ہو، میری زبان
ویأبی مدیح من	اس کی تعریف سے ابا کرتی ہے جو توہین
یستوجب الاستہزاء	کا مستحق ہے اس کو اس تہنئت سے بھی عار
ویأنف من تہنئۃ من	ہے جو باعث خوف ہو (یعنی میری زبان
یستعطی الشفقۃ ویترفع	کو تہنئت سے نفرت ہے خوفناک شخص کی،

عن هجو من يستطيع الاعراض
عنه، ويستنكف من الفخر اذ
ليس في الانسان ما يفاخر سوى
اقراره بضعفه وجهله
لكم لغتكم ولي لغتي
لكم من لغتكم البديع والبيان
والمنطق ولي من لغتي نظرة في
عين مغلوب ودمعة في
جفن المشتاق وابتسامة
على ثغر المؤمن لكم لغتكم ولي لغتي
لكم ان تلتقطوا ما يتناثر
خرقاً من اثوابكم، ولي
ان امزق كل عتيق بال و
اطرح على جانبي الطريق
كل ما يعوق مسيري نحو
قمة الجبل لكم لغتكم ولي لغتي
لكم لغتكم عجوز مقعدة
ولي لغتي صبية غارقة

وہ اس کی ہجو نگاری سے بھی بلند ہے جس سے
وہ اعراض کر سکتی ہے، وہ فخر کرنے سے
عار محسوس کرتی ہے کہ انسان جہل وضعف
کے سوا کچھ نہیں۔ تمہیں تمہاری زبان مبارک
ہو اور مجھے میری۔
تمہاری زبان میں علم بدیع، بیان اور
منطق ہے لیکن میری زبان ایک نظر ہے،
شکست خوردہ کی آنکھ پر ایک آنسو
ہے مشتاق کی پلک پر، اور ایک تبسم ہے
مؤمن کے لب پر۔ تمہیں تمہاری
زبان مبارک ہو اور مجھے میری۔
تمہاری زبان یہ ہے کہ تم زبان کے
پرانے چیتھڑوں کو جمع کرو، مگر میری زبان
یہ ہے کہ میں ہر قدیم چیز کو توڑ پھوڑ
ڈالوں اور اسے راستے کے دونوں
جانب پھینک دوں جو میری بلندی
کی راہ میں حائل ہو (یعنی پہاڑ کی چوٹی کی راہ میں)
تمہاری زبان بوڑھی کھوسٹ بیچیدہ
عورت ہے، میری زبان (عمدہ اٹھان کی)

في بحر احلام متشابهة، اقول
لكم ان النظم والنثر عاطفة
وفكر ما زاد على ذلك
فخيوط واهية واسلاك
متقطعة لكم لغتكم
ولي لغتي [1]

ایسی لڑکی ہے جو اپنی جوانی کے خوابوں
میں غرق ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ
شعر و نثر فکر و جذبات کا نام ہے، جو
اس کے ماسوا ہے وہ شکستہ دھاگے ہیں
اور ٹوٹے ہوئے تار ہیں۔ تمہارے لئے
تمہاری زبان ہے اور میرے لئے میری زبان۔

اس مختصر سے ٹکڑے میں جس بلاغت اور دلکشی بلکہ جوش وخروش کے ساتھ جبران نے اپنی زبان کے پیام کو پیش کیا ہے وہ خود ان کے نئے انداز بیان اور اسلوب تحریر کی بھی عمدہ مثال ہے جبرانی اسلوب نے عربی زبان کو ایک نئے حسین اسلوب سے آشنا کر دیا ہے، جہاں زبان و بیان کے ساتھ فکر و جذبات کے حسن زار قاری کو مسحور کر دیتے ہیں

جبران بیک وقت شاعر، ادیب اور بہت بڑے آرٹسٹ تھے، انھوں نے روسی زبان کی تحصیل بڑی محنت سے کی تھی مگر برسوں انھوں نے فن تصویر کشی سیکھا تھا۔ انگریزی پر بھی ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی، شاعری میں وہ رومانیت پسند تھے۔ ان کا مشہور قصیدہ "المواکب" (کاروان یا جلوس) شمالی اور جنوبی دونوں حصے میں رہنے والے عربوں کے لئے یکساں ایک عمدہ نمونۂ شاعری تھا۔ اس قصیدہ میں اس نے زندگی کی قدروں اور اس کے قوانین وغیرہ پر زبردست حملے کئے ہیں۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ مضطرب ہو کر لوگوں کو ابھارتا ہے کہ اس شہری زندگی کے مصائب سے وہ جنگلوں اور فطرت کے سبزہ زاروں کی طرف بھاگ جائیں اور اس سرزمین فطرت میں داخل ہو جائیں جہاں نہ عبودیت ہو نہ بادشاہت جہاں نہ ظلم ہو،

[1] بلاغۃ العرب فی القرن العشرین از محی الدین رضا طبع ثانی ص ۵۱

نہ قوت، جہاں نہ ایمان ہو نہ کفر۔ وہ ایسے مجہول مگر ابدی مقصد کی تلاش میں ہے جس کی طرف موسیقی یا نغمہ اشارہ کرسکتا ہے۔ یہی ترانہ اور یہی مقصد تمام شعراء کا ہے جو رابطۂ قلمیہ سے وابستہ تھے، وہ روحِ وجود کے متلاشی ہیں، تاریک حقائق کا انکشاف چاہتے ہیں، ایک مجہول ابدی حقیقت ان کا محور ہے۔[1]

خلیل جبران ان مہاجر ادیبوں اور شاعروں کی مابہ الامتیاز خصوصیات کی تشریح و تعبیر پوری طرح سے کر دیتے ہیں مگر اس کے بعد بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے بزرگ ادیب و صاحب بصیرت ناقد مہجری ادبا پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی زبان کو غیر معیاری قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کون معیاری اسلوب و زبان کا حامل ہے بلکہ یہاں دیکھنا صرف یہ چاہئے کہ رابطۂ قلمیہ کے ان ادیبوں اور شاعروں نے طویل نظمیں کہیں، مقالے لکھے اور انشاء پردازی میں ایک نئی راہ ایجاد کی، شاعری میں قافیہ کی قید کو ہلکا کر دیا، اوزان میں ان بحروں کی پابندی نہیں کی جو خلیل بن احمد کے زمانے سے چلی آتی تھیں۔ تعبیروں میں روایتوں کو چھوڑ کر انگریزی ادب سے نئے انداز تعبیر اختیار کئے۔ جب نئے تجربات ہوتے ہیں تو لغزشیں بھی سامنے آتی ہیں مگر اس عظیم نثری اور شعری سرمایہ کی کمیت و کیفیت پر نظر رکھنی چاہئے کہ اس نے عربی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے اور اس کے سامنے ایک نیا افق پیش کیا ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں اسالیب عرب سے انحراف ہے اور ان کی زبان میں اجنبیت ہے علاوہ ازیں ان کے خیالات میں مذہبیت نہیں ہے، کہیں یہ اسلام اور نصرانیت دونوں مذاہب کے باغی نظر آتے ہیں اور کہیں لامذہبیت کے عناصر ان کے اندر ظاہر ہوتے ہیں اور کہیں یہ تناسخ کے علمبردار بن کر سامنے آتے ہیں اور تفاؤل و تشاؤم کے فلسفہ کی ترجمانی بھی کرتے ہیں مگر ان سب کے باوجود عربی ادب میں جو نہایت تازہ دم اور نہایت قابل قدر نثری و شعری سرمایہ کا انھوں نے اضافہ کیا ہے اس کو نظر انداز کرنا حقائق سے اغماض برتنا ہے۔

[1] دراسات فی الشعر العربی المعاصر، از شوقی ضیف، طبع سابع ص ۱۸۲

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی

از

جناب صالحہ رشید، شعبۂ فارسی، حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الٰہ آباد

دلّی کی سیاسی اور سماجی حالت بہت بگڑ چکی تھی اور انگریزی اقتدار سرکار مغلیہ پر غالب آچکا تھا۔ برائے نام آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے ہر طرح بے اختیار اور بے بس کر رکھا تھا۔ وہ کہنے کو تو فرماں روا تھے لیکن انگریزوں کی فرماں برداری کے لئے مجبور کئے جاتے تھے۔ دہلی اجڑ چکی تھی اور ماہرین فن دہلی چھوڑ چھوڑ کر لکھنؤ اور فرخ آباد کو بسا رہے تھے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی نے ایسے ہی ناگفتہ بہ ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ وہ خاندانی رئیس تھے لیکن ریاست انگریزوں نے ضبط کر لی تھی اور جہانگیر آباد کا وہ علاقہ ان کی جاگیر رہ گیا تھا جو انھوں نے ذاتی طور پر خریدا تھا۔ لیکن بہرحال ان کی مالی حالت بہتر تھی اور وہ رئیسانہ زندگی گزارنے کی استطاعت رکھتے تھے، انگریز حکمرانوں نے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور انھیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے پر مجبور کیا لیکن نواب صاحب ہر حال میں صابر و قانع بنے رہے۔

نواب صاحب کا نام محمد مصطفےٰ خاں تھا، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری کب شروع کی، یہ تو قطعی طور پر اس لئے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔ خود شیفتہ کے بیان کے مطابق "از وان صبا بایں شغل منوط بودہ" لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سولہ سال کی عمر میں انھیں شعر گوئی پر قدرت

حاصل ہو گئی تھی، دوسری جگہ خود شیفتہ کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکیس[۲۱] سال کی عمر میں وہ فن شاعری میں پیر طریقت ہوئے۔

اے شیفتہ اس میں ہوں اک پیر طریقت — گو عمر ہے میری ابھی اکیس[۲۱] برس کی

اساتذہ وہ شعر گوئی میں مومن خاں مومن سے تلمذ رکھتے تھے اور "گلشن بے خار" میں ان کا ذکر بڑے اچھے اور عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ مومن کی وفات کے بعد مرزا غالب سے رجوع کیا، اگرچہ غالب بوڑھے ہو چکے تھے اور انھیں اپنے دور انحطاط کا پورا احساس تھا۔

تلامذہ شیفتہ کے خود اپنے تلامذہ کی تعداد بہت تھی اور ان میں سے بھی بعض نے استادی کا درجہ حاصل کیا اور اپنی لیاقتوں کے سبب انھیں ایک اہم علمی درجہ حاصل تھا۔

شیفتہ کے ایسے شاگردوں میں سید منور علی ابن سید علی نوازی، آشفتہ دہلوی، فدا حسین فدا، حکیم محب علی نیر کاکوروی، اشرف بیگ خاں اشرف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا خواجہ الطاف حسین حالی ان کے صاحبزادے کے اتالیق کی حیثیت سے ان کے زیر تربیت رہے اور حالی کے ادبی مذاق کی جلا شیفتہ کی صحبت سے ہوئی۔ اس کا اعتراف خود حالی جیسے عظیم المرتبہ شاعر و ادیب نے کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ[۱] سے مستفیض ہوں — شاگرد میرزا[۲] کا مقلد ہوں میر[۳] کا

معاصرین ان کے معاصرین میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ، امام بخش صہبائی، غلام علی خاں وحشت، نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں، مولوی عبد اللہ علوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ان کے دور کے مشہور اصحاب علم و کمال تھے، جن سے شیفتہ کے اچھے تعلقات تھے۔

---

۱ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ، ۲ میرزا غالب دہلوی، ۳ میر تقی میر دہلوی

تصانیف شیفتہ استادانِ فن میں شمار ہوتے تھے اور انھوں نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان کا ایک اہم علمی مقام ہے۔ شیفتہ کی تصانیف حسب ذیل لافانی اہمیت رکھتی ہیں اور مرورِ ایام کے ساتھ ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

۱۔ تذکرۂ گلشنِ بے خار:۔ یہ شیفتہ کی فارسی نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس میں انھوں نے مذکورہ شعراء کا ذکر بے لاگ طریقہ پر کیا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ فارسی نثر میں ہے لیکن اردو کے شعراء سے متعلق ہے۔ عرصہ ہوا کہ نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا لیکن آج تک کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسے شاعروں کا ذکر ملتا ہے جو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ۱۲۴۸ھ میں اس تصنیف کا آغاز اور ۱۲۵۰ھ میں اختتام ہوا۔ مومن کی زندگی میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی، چنانچہ خود ان کا قطعۂ تاریخ بھی کتاب کے خاتمہ پر شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب میں حروفِ تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے اور چھ سو سٹھ[۶۶۵] شعراء کا تفصیلی ذکر اور ان پر مبصرانہ رائے پیش کی گئی ہے، چاہے ان کی رائے اور تنقید لوگوں کے لئے سخت اور ناگوار کیوں نہ رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بڑی جامعیت کے ساتھ بے لاگ رائیں پیش کی ہیں، حد یہ ہے کہ میر تقی میر جیسے خدائے سخن کی قصیدہ نگاری کو پست قرار دینے میں انھیں کوئی عذر نہیں ہوا۔ گو تذکرہ بہت طویل نہیں ہے لیکن اختصار کے باوجود اس میں جامعیت کی خوبی نمایاں ہے۔

۲۔ رقعات فارسی:۔ ستاون[۵۷] فارسی مکاتیب پر مشتمل یہ کتاب بھی شیفتہ کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہے۔ خطوط میں بے تکلفی، سادگی اور انشا پردازی کے ساتھ ہی بلاغت بھی ملتی ہے۔ ان ستاون[۵۷] خطوط میں سے بیشتر حکیم مومن خاں مومن دہلوی، مرزا اسد اللہ خاں غالب،

مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام لکھے گئے ہیں۔ ذاتی حالات بے تکلفی سے مسائل کا بیان اور اپنے نجی خیال کے اظہار کے لئے ان خطوط کی اہمیت تھی ہی انشا، اور بلاغت کے لحاظ سے یہ خطوط ممتاز ہیں۔ حالانکہ عام طور پر خطوط نگار اور مضمون نگار میں فرق ہوتا ہے لیکن شیفتہ کے ان مذکورہ خطوط میں انشا اور بلاغت کے نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ بیشتر رقعات تصوف کے عنوان سے متعلق ہیں اور دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۳ھ میں یہ کتابی شکل میں مرتب کئے گئے۔ ایک خط میں مرزا غالب کے ایک خط کی رسید اس طرح لکھی ہے۔

"لذت افزا چوں لعل شکرخا، تمکین تر زخندۂ دلبر، دلرباتر زعشوۂ شاہد، قاصد نیرنگ، نسیم صفت، در زبانِ خوش آمد و آورد، خاطرم شگفتہ شد، گل گل مست گشتم، زشاد مانیہا، بہرہ بردم زکام رانیہا۔"

۴۔ رہ آورد:۔ فارسی نثر میں شیفتہ کے سفر حج و زیارت بیت اللہ کے بیانات پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "سراج منیر" کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کا عربی نام "ترغیب السالک الی احسن المسالک" ہے۔ شیفتہ کو مدت سے حج کی آرزو تھی لیکن اس کی تکمیل دیر سے ہوئی ابتدائی عمر میں نہ تو اس کا موقع ہی آیا اور نہ انھوں نے خود اس کی طرف توجہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لہو و لعب میں عمر کا ابتدائی حصہ گزارا۔ عیش و سرمستی اور عنفوانِ شباب کی رنگینی سے دوچار رہے، ان دنوں انھوں نے عشق مجازی کی راہ میں بھی قدم رکھا لیکن اس سے جلد ہی تائب ہو کر عشق حقیقی کی راہ اختیار کرلی۔

حج کا سفر تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت میں طے ہوا۔ کیونکہ حادثات سے دوچار ہونا پڑا

اور ان دنوں سفر اتنا آسان بھی نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔

"رہ آورد" میں ان کا انداز تحریر سادہ اور شگفتہ نظر آتا ہے۔ "رقعات" کے برعکس اس کتاب میں سادگی زیادہ پائی جاتی ہے۔

۴۔ مولد کا اردو ترجمہ:۔ ابن جوزی کی کتاب مولد کا بھی انھوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مالک رام نے "تلامذۂ غالب" کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے دونوں میں تبحر ترجمہ کی شرط اولیں ہے اور نواب شیفتہ اس خوبی کے حامل نظر آتے ہیں۔

۵۔ دیوان اردو:۔ شیفتہ کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ الفاظ کی بندش اور ترکیب کی خصوصیات ان کا امتیازی وصف ہے جس میں وہ اساتذۂ فن کے شریک غالب نظر آتے ہیں۔ یہ دیوان ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا کیونکہ وہ منہیات شرعی سے تائب ہو چکے تھے اور شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔

۶۔ دیوانِ فارسی:۔ سات قصیدوں، بکثرت قطعات، رباعیات اور غزلیات پر مشتمل ہے اور مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ حمد، نعت، منقبت، تصوف، اخلاق، حکمت اور محبت کے مضامین اس دیوان میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ قصائد کی تعداد سات ہے لیکن ان میں سے ایک بھی کسی دنیاوی ممدوح کی شان میں نہیں ہے۔ ایک قصیدہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی مدح میں ہے اور چھ قصیدے پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہے گئے ہیں۔ عرفی اور خاقانی کی زمینوں میں یعنی "بیاباں رفتم" "شہلا گریستی اور زلیخا بر آورم" خاص طور پر بڑے اہم ہیں اور ان قصائد میں شیفتہ کا فن بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

۷۔ قلمی کلیات اردو:۔ ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اور اس کا واحد قلمی نسخہ

کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔ اس کلیات میں شیفتہ کا بہت سا ایسا کلام بھی موجود ہے جو آج تک کبھی شائع نہیں ہوا مثلاً ان کی تین مثنویاں بھی اس کلیات میں ملتی ہیں۔ جن سے ان کی مثنوی گوئی نیز عاشقانہ جذبات کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق ان کے پڑھنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ ایک ایک لفظ کو وضاحت سے ادا کرتے اور غزل پڑھنے میں پڑھانے کا انداز نمایاں رہتا اور خود شیفتہ کا کہنا ہے ؎

یہ طرزِ ترنم کہیں زنہار نہ ڈھونڈو ۔۔۔ اے شیفتہ یا مرغِ چمن رکھتے ہیں یا ہم

یا ایک جگہ فارسی دیوان میں ان کا کہنا ہے ؎

حسرتی نازش ہند است بہ شیریں سخنی ۔۔۔ ایں چنیں طوطیٔ خوش لہجہ بہ ہر جا نبود

شجرۂ طریقت | نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کا شجرۂ طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے ملتا ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

(۱) حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۲) حضرت محمد معصوم (۳) حضرت سیف الدین (۴) حضرت نور محمد بدایونی (۵) حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۶) حضرت شاہ غلام علی (۷) حضرت ابو سعید دہلوی (۸) حضرت عبد الغنی (۹) نواب محمد مصطفیٰ خاں۔[1]

تدین | یہی وجہ تھی کہ ان میں مذہب کا احترام اور دین داری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں منفرد تھے اور زندگی کے ہر حصہ میں اس پر سختی سے عمل کرتے رہے۔ انگریزوں نے انھیں بغاوت کے الزام میں سزا دی لیکن انھوں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ جاگیر ضبط ہوئی لیکن ان کی جبین پر شکن نہیں آئی۔ نواب صدیق حسن خاں کی کوشش سے علاقہ واگزار ہوا اور ان کی پنشن بحال ہوئی۔

---

[1] دلی کے بائیس خواجہ صفحہ ۲۳۶

معمولات | شیفتہ آخر شب میں اٹھ کر نماز تہجد، وظائف اور نماز فجر و تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے۔ دائرۂ احباب وسیع تھا اور وہ اکثر شام کو اپنے احباب کی صحبت میں وقت صرف کرتے تھے۔ انھیں املا اور زبان کے محاورات کا بڑا لحاظ تھا۔ کلام بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن فنی اغلاط سے پاک۔ انھیں تصوف کی کتابوں کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا اور وہ اپنا بیشتر وقت اس میں صرف کرتے تھے۔ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں سے ان کے روابط تھے، اور وہ ان سب کے ساتھ رواداری اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ گوشہ نشینی اور کم سخنی ان کی عادات میں سے تھیں۔ وہ اکثر اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے اور اپنی زندگی صوفیانہ طور سے گزارتے تھے۔

ترسٹھ سال کی عمر یعنی ۱۸۶۹ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور زندگی بھر ہجر محبوب کے بعد وصال سے لذت یاب ہوئے۔

سرسید احمد خاں، مولوی محمد یحییٰ تنہا، مولانا الطاف حسین حالی، نواب صدیق حسن خاں، عبد الغفور نساخ، مرزا قادر بخش صابر، پنڈت لچھمی نرائن شفیق اور ماہر غالبیات مالک رام نیر، تاریخ ادب اردو کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ جیسی شخصیتوں نے ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں اچھے تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

اخبار علمیہ

ترقی اردو بیورو ہند نے تقریباً ۱۰ برس قبل اردو انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کی ذمہ داری مولانا ابو الکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد کے سپرد کی تھی، جس نے یہ انسائیکلو پیڈیا ۱۲ جلدوں میں لکھ کر مکمل کر دی، مگر بعض مشکلات کی وجہ سے اسکی طباعت میں تاخیر ہوتی رہی، خوشی کی بات ہے کہ اب اپریل ۲۰۰۹ء سے یہ "مخزن علوم" کے نام سے طبع ہو رہی ہے، آئندہ چار برس میں اس کی تمام جلدیں شائقین کے ہاتھوں میں ان شاء اللہ پہونچ جائیں گی ہر جلد کے ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ صفحات ہوں گے، پہلی چار جلدوں میں ہندوستان، اردو اور مسلمانوں سے متعلق مضامین کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادب، فنون، قانون، تاریخ عالم، معاشیات اور حیوانیات وغیرہ پر حروف تہجی کے لحاظ سے مضامین ہوں گے، بقیہ آٹھ جلدوں میں مذکورہ بالا موضوعات کے ضمن میں مختصر تحریریں شامل ہیں، اس میں تیرہ ہزار تحریریں ہیں جو تقریباً ۵۰۰ ماہرین علوم کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہیں، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بجائے کتابت کے نستعلیق کمپیوٹر سے کام لیا جائے گا۔

جناب رام لعل نابھوی ہریانوی، اردو کے معروف طنز نگار اہل قلم ہیں، ٹائمز آف انڈیا سے انکی اس انفرادیت کا بھی علم ہوا کہ ان کے پاس ۶ زبانوں میں رامائن کے تقریباً ۸۰ نسخے موجود ہیں آج کے غیر اردو داں طبقہ کیلئے شاید یہ بات حیرت انگیز ہو کہ ان میں ۶۰ نسخے ایسے ہیں جو اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں ہیں، انکے لکھنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں، ان میں سب سے پرانا نسخہ ۵۰۲ برس پہلے کا ہے اسکا نام مسیحی رامائن ہے جو مسیح پانی پتی سے منسوب ہے، رامائن کا فارسی نسخہ ملا عبد القادر بدایونی

کا ہے، اس کے علاوہ فارسی ہی میں رامائن کے دو مختصر نسخے امانت رائے امانت دہلوی اور منشی ہر سنگھ دہر گوجرانوالوی کے بھی ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا کے قارئین کی اکثریت کو یہ علم بھی ہوا تا کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں رامائن کے چار ترجمے ہوئے اور یہ سب اسی سے معنون ہیں، جناب نابھوی کے علم میں رامائن کے ۳۰۰ نسخے اور ہیں جن میں دو عربی میں، ۸۰ فارسی میں اور ۲۰۵ اردو میں ہیں، ان میں دائرائے دہی حیدر آبادی کی یک قافیہ رامائن، نفیس خلیلی اور امتیاز الدین خان کی مثنوی رامائن اور دانق لکھنوی کی رامائن بہت عمدہ ہیں، ہریانوی زبان میں بھی احمد بخش تھانیسری کی ایک رامائن ہے جسے اب حکومت ہریانہ شائع کرنے والی ہے۔

رشی کیش کے ادارہ ہندو فاؤنڈیشن نے ہندو مذہب کے نظریات و تعلیمات کو فروغ دینے کیلئے انگریزی میں ایک انسائیکلو پیڈیا بیس جلدوں میں شائع کرنے کا عزم کیا ہے، اس پر لگ بھگ ۱۰ کروڑ روپیے صرف ہوں گے، اس میں ہندو مذہب کے آغاز و ارتقاء، جنوب مشرقی ایشیا میں اس کے عروج و فروغ اور موجودہ زمانہ میں یورپ میں اسکی تحریکوں کے اثرات اور ہندو افکار و نظریات سے متعلق معتبر اور مستند مقالے ہوں گے، یہ منصوبہ ۲۰۰۵ء میں ہندو ہیریٹیج ریسرچ فاؤنڈیشن (H.H.R.F) کے سربراہ سوامی چدانند سرسوتی کی رہنمائی میں بنا تھا، اس میں ہند و بیرون ہند کے ممتاز اہل قلم و دانشور بھی حصہ لے رہے ہیں۔

جہاں مذہبی افکار و رجحانات کو فروغ دینے کی کوشش جاری ہیں وہاں الحاد و بے دینی بھی برگ و بار لا رہی ہے، روس کے ترکمانستان پبلشنگ ہاؤس نے حال ہی میں ز سخت بیرانوف کی ایک کتاب دی ریلیٹی آف اسلام (حقیقت اسلام) کے نام سے شائع کی ہے، اس میں اسلام کے بانی اور مبلغین، مسلمانوں کے فرائض، مذہبی رسوم، اخلاقی اصول، قرآن، محنت اور تمدن اسلام کا نظریۂ نسواں، سرزمین ترکمان میں اسلام، ترکمانستان میں مادہ پرستی اور دہریت کی کامیابی

اور نوع انسانی پر مذہب کے منفی اثرات جیسے موضوعات شامل ہیں، ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام پر اشتراکی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔

اسی ادارہ نے ترکمانی زبان میں ایک اور کتاب "دہریت اور مذہب سوال وجواب" کے نام سے شائع کی ہے، اس میں اسلام کے ساتھ چرچ کو بھی شریک کرلیا ہے، اس میں تقریباً وہی ابواب ہیں جو پہلی کتاب میں ہیں۔

حریت تحریر اور شرافت قلم کے اعلیٰ اصولوں کو جسطرح پامال کیا جاتا ہے اسکی ایک مثال سلمان رشدی کی کتاب ہے، اب مصری حکومت نے ایک خاتون مس اعتماد خورشید کی ایک کتاب "ذاتی ڈائری" کی اشاعت پر پابندی لگادی ہے، جمال عبدالناصر کے انتظامیہ میں مس خورشید اپنے حسن وجمال اور فروغ جلوہ کی وجہ سے بہت مقبول تھیں، محکمہ سراغرسانی کے سربراہ صلاح نصر سے ان کے بڑے تعلقات تھے، مصر کے اعلیٰ طبقہ کی خلوتوں اور جلوتوں کی اس داستان سے وظیفہ یاب عہدیداروں کے علاوہ بعض موجودہ اہم عہدہ دار بھی مشکل میں پڑگئے ہیں، لیکن پابندی کے باوجود یہ کتاب خفیہ طریقہ سے "گرم فلافل" (گرم مرچوں) کی طرح فروخت ہو رہی ہے۔

مصر کی ایک خبر یہ بھی ہے کہ جامعہ ازہر نے اب جاکر اسلامی شریعت کی تعلیم کا ایک شعبہ انگریزی زبان میں قائم کیا ہے، فرانسیسی، جرمن، اور سواحلی زبانوں میں پہلے سے یہ شعبہ قائم ہے۔

گذشتہ دنوں ترکی کے شہر ازمیر میں ایک عالمی نمائش ہوئی تھی، سعودی عرب کے گوشہ میں حرمین شریفین کے ماضی وحال کی مصور تاریخ اور مستقبل کے خاکے نہایت خوبصورتی سے رکھے گئے تھے، غلاف کعبہ کی تیاری میں جس جدت، محنت اور نزاکت کا اہتمام کیا جاتا ہے اسکا بھی نمونہ رکھا گیا تھا، اس موقع پر ملک فہد اکیڈمی کے شائع کردہ قرآن مجید کے ترکی ترجمہ کے نسخوں کو کثیر تعداد میں تقسیم کیا گیا، ترکی کے کثیر الاشاعت اخبار زمان نے

لکھا ہے کہ ترکی کے عوام کی اکثریت کے دل حرمین شریفین کی محبت سے معمور ہیں جس کا اندازہ اس نمائش میں ان کی غیر معمولی شرکت سے ہوا۔

ڈاکٹر انعام اللہ خان موتمر عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری اور مذہب وامن کی عالمی کانفرنس (WCRP) کے صدر ہیں، مذہب کے فروغ اور مختلف ادیان ومذاہب کے درمیان افہام وتفہیم کے سلسلہ میں ان کی خدمات نمایاں ہیں، چنانچہ ان کے اعتراف میں آسٹریلیا میں انکو ۲۰۰۰۰۰ پونڈ کا ٹمپلیٹن ایوارڈ دیا گیا ہے، ۱۹۷۲ء میں برطانیہ میں ایک انسان دوست سرجان ٹمپلیٹن نے اس ایوارڈ کا آغاز کیا تھا، ابتک یہ گرانقدر انعام ایگزنڈر سولزنٹسن، مدر ٹریسا، رادھا کرشنن اور ریورنڈ نوا تو حاصل کرچکے ہیں۔

ڈاکٹر انعام اللہ خان برما میں پیدا ہوئے اور تعلیم وکالت کے پیشوں سے اپنی عملی زندگی کی ابتدا کی، ۱۹۵۱ء سے وہ موتمر عالم اسلامی سے وابستہ ہیں، انھوں نے اپنے انعام کی ساری رقم بہبودی بشر کے بین الاقوامی ادارہ کے لیے وقف کردی ہے۔

دیوبند، ندوہ اور دوسرے مدارس دینیہ کو چاہیے اس پر مطلق حیرت نہ ہو مگر مادہ پرست دنیا نے اس خبر پر تعجب کا اظہار کیا کہ انگریزی زبان کی قدیم ترین یونیورسٹی آکسفورڈ کے ارباب انتظام یونیورسٹی کی سقیم مالی حالت کے پیش نظر عالمی پیمانہ پر چندہ کی مہم شروع کر رہے ہیں، ان کا مقصد سردست ۳۴۰ ملین ڈالر (تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ) جمع کرنا ہے، مہم کے محرک ہنری ڈرکر نے بتایا کہ ۱۹۲۰ء تک آکسفورڈ کے مصارف انفرادی عطیات سے پورے کیے جاتے تھے، پھر حکومت نے یہ ذمہ داری قبول کرلی مگر اب اس سال امداد میں کمی کردی جس سے معمولی ملازموں اور نئے تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں بڑی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں، اسوقت ننانوے لکچرار و ۱۶ پروفیسروں کی جگہیں خالی ہیں نئے منصوبوں میں مشہور عالم اور برطانیہ میں انڈیا آفس لائبریری کے بعد دوسرے سب سے بڑے کتبخانہ بوڈلین لائبریری کی تنظیم نو بھی شامل ہے، اسکے ہندوستانی حصہ میں ۸۰ ہزار کتابیں اور مخطوطات ہیں جو محققین کیلئے اہم مصادر وماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "ع۔ص"

وفیات

مولانا ابوالعرفان خاں ندوی صاحب مرحوم

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی رفیق دارالمصنفین

جناب مولانا ابوالعرفان خاں ندوی صاحب ۱۷ر نومبر کو تقریباً ساڑھے تین بجے شب میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

عالم کی موت کو عالَم کی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، مولانا مرحوم کی وفات ہوئی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ علوم کا ایک جہان ویران ہو گیا ہے، ان کے احباب و رفقا اور متعلقین و تلامذہ ہی خوب جانتے ہیں کہ کیسی مجموعۂ فضائل ہستی کو انھوں نے سپردِ خاک کر دیا۔

مولانا مرحوم کا وطن شیراز ہند دارالخیر جونپور تھا، لیکن جونپوری کی نسبت محض ایک وطنی نسبت نہیں تھی، ان کی شخصیت میں علم و ادب، فلسفہ و کلام، وقار و استغناء، تواضع، منکسر المزاجی، مہمان نوازی بلکہ دلنوازی کی وہ تمام روایات مجتمع تھیں جن کے لیے خطۂ جونپور کبھی رشک ہرات و نیشاپور تھا اور جن کی وجہ سے صاحبقران بادشاہ شاہجہاں نے کہا تھا کہ پورب شیراز ماست۔

وہ جونپور کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے ان کے والد جناب مولانا ادین محمد صاحب اس علاقہ کے مشہور عالم دین تھے اور مولانا حافظ عبداللہ غازیپوریؒ کے خاص

شاگرد تھے جو اتباع سنت اور زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے۔

والد ماجد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں زیر تعلیم رہے، دارالعلوم دیوبند میں بھی داخلہ لیا مگر جلد ہی ۱۹۳۹ء میں ندوہ آگئے اور یہیں تعلیم مکمل کی، فراغت کے بعد دارالمصنفین میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی میں فلسفہ و کلام اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور دم واپسیں تک ندوہ سے ان کا رشتہ استوار رہا، ۱۹۶۷ء میں شیخ عبداللہ مرحوم کی دعوت پر کشمیر کے ایک تعلیمی ادارہ سے بھی وابستہ رہے لیکن جلد ہی ندوہ واپس تشریف لے آئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی مرحوم کے بھوپال میں مستقل قیام پذیر ہونے کے بعد مولانا ابوالعرفان خاں ندوی نے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۷ء تک ان کی جانشینی کی۔

وہ معقولات کے متبحر عالم تھے، منطق، فلسفہ، کلام اور بلاغت و معانی کے فن پر ان کو عبور حاصل تھا، نقلی علوم میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، خصوصاً تفسیر، تاریخ اور شعر و ادب میں اچھی دستگاہ تھی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں "مولانا ابوالعرفان ندوی اچھا تاریخی ذوق رکھتے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ سے ان کو خصوصی دلچسپی ہے" ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے حکیم و فلسفی ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فلسفہ میں ادب کی اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، ان کے چار سو سال بعد شیراز ہند ہی کے اس نامور فرزند اور ملا صاحب کے ایک ہم وطن مولانا ندوی کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ عربی اشعار ان کے نوک زبان

رہتے تھے، اردو شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا، کلام اقبال کے تو گویا وہ حافظ تھے۔

علوم جدیدہ سے واقف تھے، عصری افکار و نظریات اور جدید تعلیمی تقاضوں سے بھی باخبر تھے، اسی لیے کئی یونیورسٹیوں کے تعلیمی شعبوں اور نصاب کمیٹیوں کے ممبر بنائے گئے، لکھنؤ کے بورڈ آف اورینٹل اسٹڈیز عربی و فارسی کے وہ ۱۹۶۷ء سے رکن تھے، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ان سے وقتاً فوقتاً مشورے لیتا تھا، بعض سرکاری وفود میں بھی وہ شریک کیے گئے، درحقیقت وہ تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کے ترجمان اور ان کا عملی نمونہ تھے، قدیم بنیادوں پر استوار وہ ایسی مستحکم عمارت کی مانند تھے جس پر جدید رنگ و روغن کی مینا کاری نہایت دلکش و دلآویز منظر پیش کرتی تھی۔

مدارس دینیہ کی طرح جدید دانش گاہوں کی علمی مجالس میں وہ خاص طور پر مدعو ہوتے، سیمناروں میں ان کے غور و فکر پر مبنی مقالے اپنے توازن و اعتدال اور متانت و وقار کے سبب اہل علم کی نظر میں باوزن قرار پاتے تھے، کئی برس قبل ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ دہلی نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر سیمینار کیا تھا اس میں انھوں نے "فکر اسلامی کی تشکیل جدید ضرورت و اہمیت" کے عنوان سے جو مختصر مقالہ پڑھا وہ بڑا پُر مغز تھا۔

دارالمصنفین سے ان کے روابط دیرینہ تھے، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فیض یافتہ تھے، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں سید صاحبؒ پر ایک سیمینار ہوا تو اس میں انھوں نے "دید و شنید" کے عنوان سے حضرت سید صاحبؒ کے چند افادات پیش کیے جن سے طالب و مطلوب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، دارالمصنفین سے انکی کتاب

"اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" شائع ہوئی جو مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کا ایسا سلیس و شگفتہ ترجمہ ہے جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے، دارالمصنفین سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا، وہ یہاں کی علمی ترقیوں کے لیے برابر مشورے دیتے، وقت نکال کر تشریف بھی لاتے اور نئے رُفقاء کی رہنمائی و حوصلہ افزائی بھی فرماتے، وہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔

مولانا مدۃ العمر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہیں کرسکے، تاہم ان میں ایک کامل الفن کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں، مکتبہ جامعہ نے ان کی ایک مختصر کتاب "ائمہ اربعہ" شائع کی تھی جو اوسط درجہ کے اردو خواں قارئین کے لیے لکھی گئی تھی، مگر معلومات اور اسلوب کے لحاظ سے وہ ہر طبقہ کے لیے مفید ہے، سیمناروں کے مقالوں کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کی تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی ہیں اگر ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ شائع کیا جائے تو یہ مفید علمی خدمت ہوگی۔

نجی زندگی میں وہ مرد قلندر کی طرح سادہ و آزاد تھے، ان میں علم کے پندار و تفوق کا کوئی شائبہ نہ تھا، ان کی سادگی دیکھ کر یقین نہ آتا کہ اس پرسکون سمندر کی تہہ میں علم کے بیش قیمت موتی بھی موجود ہونگے، وہ بارعب اور وجیہہ تھے مگر اپنے شاگردوں اور نیازمندوں کے سامنے بھی شاخ ثمر بار کی مانند خم ہوجاتے، چہرہ متبسم رہتا، ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی، باتوں سے گلوں کی خوشبو آتی، عمدہ کھانوں کے شوقین تھے لیکن اس سے زیادہ کھلانے کا شوق تھا،

ان کی وفات سے علماء کی جماعت میں جو کمی ہوئی ہے وہ برسوں محسوس کی جائے گی وہ ہماری جماعت کے اہم رکن تھے خاص طور سے ندوہ کے لیے یہ بڑا جانکاہ حادثہ ہے اس کے حلقۂ تدریس میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم کے بعد یہ دوسرا بڑا خلا پیدا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پر کرے اور انکے پسماندگان اور ہم سب کو اس حادثہ فاجعہ پر صبر کی توفیق دے، انکی نیکیوں کو قبول کرے اور اعلیٰ علیین میں بلند سے بلند درجات سے سرفراز فرمائے آمین۔

پروفیسر سید حسن مرحوم

افسوس کہ ۸؍نومبر ۸۸ء کو صبح ۸½ بجے اردو اور فارسی کے نامور معلم و محقق جناب پروفیسر سید حسن کا پٹنہ میڈیکل کالج میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، چند دنوں پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۸۷ برس کی تھی۔

وہ ۱۹۱۱ء میں اپنے ننہالی گاؤں شیخ پورہ ضلع مونگیر میں پیدا ہوئے، اسی ضلع کا اہرہ گاؤں ان کا آبائی وطن تھا، یہاں کے سادات کا تعلق حضرت سید احمد جاجنیریؒ سے ہے، پروفیسر سید حسن کا خاندان بھی جاجنیری تھا، والدہ کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شیخ شعیبؒ برادر عم زاد حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے ملتا ہے، جب وہ ۷،۸ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا لیکن ماں کی شفقت و تربیت نے یتیمی اور محرومی کا احساس نہ ہونے دیا اور نامساعد حالات کے باوجود وہ تعلیمی مراحل طے کرتے رہے اور مڈل، میٹرک، انٹر اور گریجویشن کے سارے امتحانات میں اول آئے ۳۵ء میں اردو میں ۳۷ء میں فارسی میں ایم اے کیا، ۳۶ء میں انھوں نے ایجوکیشن میں ڈپلوما بھی لیا، بعد میں ۱۹۰۶ء میں انھوں نے دانش گاہ تہران ایران سے فارسی جدید زبان پہلوی اور فارسی قدیم میں ڈپلوما حاصل کیا، طہران میں ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

تعلیم ختم ہونے کے بعد ان کے مشغلہ تدریس کا آغاز ہوا، ۳۷ء میں بہار نیشنل کالج میں وہ فارسی اردو کے لکچرر مقرر ہوئے، ۷ سال کے بعد ۴۴ء میں پٹنہ کالج میں لکچرر ہوئے اور اسی کالج میں وہ ۵۰ء میں اسسٹنٹ پروفیسر اور چھ سال کے بعد ترقی کرکے ۶۱ء تک پروفیسر رہے، اسی عرصہ میں حکومت بہار نے عربی و فارسی میں مطالعہ و تحقیق کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تو وہ اس میں منتقل ہوگئے، اور اس کے ڈائرکٹر ہوئے، ۶۴ء میں وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ہوئے، اور ۷۳ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے پھر ۸۰ء تک یو جی سی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

فارسی زبان کے معلم کی حیثیت سے ان کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں، وہ صدر شعبہ ہوئے تو محنت، دیدہ ریزی و جاں کاہی کی ایک مثال قائم کردی، ان کی نگرانی میں کم از کم ایک درجن شاگردوں نے پی، ایچ، ڈی کی سند حاصل کی، اور شعبہ کے دوسرے اساتذہ بھی علمی و تحقیقی کاموں کی طرف راغب ہوئے بہترین طالب علموں کے لیے ایرانی سفارت خانہ کے مالی تعاون سے طلائی تمغے جاری کئے، دوسرے ذرائع سے بھی کوشش کرکے وظائف جاری کرائے، ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر شرف عالم، ڈاکٹر عبد الغفار انصاری، ڈاکٹر سمیع الحق، ڈاکٹر حمید انوار اور سید صفی وغیرہ علمی و تدریسی مشاغل میں مصروف ہیں اور نیک نام ہیں۔

ان کی علمی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں پروفیسر عبد المنان بیدل، پروفیسر حافظ شمس الدین احمد منیری اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد جیسے نامور اہل علم و قلم کی توجہ کو بڑا دخل رہا، شروع میں سید حسن مرحوم نے افسانہ نویسی پر بھی توجہ دی، ان کے افسانے مخزن، ادبی دنیا، ندیم اور معاصر وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے لیکن یہ ان کا طبعی ذوق نہ تھا، پھر مکروہات دنیا کی الجھنوں میں وہ ایسے گرفتار ہوئے کہ ایک عرصہ تک کچھ نہ لکھ سکے، ایران جانے سے قبل انھوں نے پھر اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور فارسی اور اردو ادبیات سے متعلق ان کے مضامین و مقالے نگار، شاہکار اور نوائے ادب میں شائع ہوئے، معارف میں بھی ان کی کئی تحریریں چھپیں، جب وہ خواجہ عبد اللہ انصاریؒ ہروی پر ایک سمینار میں شرکت کے لیے افغانستان گئے تو ان کا مفید و دلچسپ سفرنامہ معارف کے دو شماروں میں سر مقالہ کی حیثیت سے شائع ہوا، خواجہ عبد اللہ ہروی پر ان کا فاضلانہ مضمون بھی معارف کے صفحات کی زینت بنا۔

دار المصنفین اور معارف کے وہ بڑے قدرشناس تھے، بقول مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم پروفیسر سید حسن صاحب دار المصنفین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں"، جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم ان کے بچپن کے ساتھی تھے، بچوں کے رسالہ غنچہ بجنور سے دونوں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا، کالج میں بھی یہ ساتھ ساتھ رہے، بچپن کی یہ دوستی اور بے تکلفی آخر تک باقی رہی، ایک سفر میں مجھے بھی ان دونوں ناموروں کی اس پاک اور سادہ دنیا دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں عمر، علم، عزت اور عہدوں کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور صرف ماضی کی معصوم یادوں کے نقوش روشن ہوتے جاتے ہیں، سید صباح الدین صاحب جب انکو خط لکھتے تو وہ بھی بے تکلفی اور قدیم ربط و محبت کا نمونہ ہوتے، ایک خط میں لکھا کہ "تم میری طالب علمی کے ہیرو رہے ہو اس لیے جب تم یاد آتے ہو تو اسی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہو"، عجب اتفاق ہے کہ ۱۸ نومبر، سید صباح الدین صاحب کے سب سے بڑے علمی ممدوح علامہ شبلیؒ کی تاریخ وفات بھی ہے، گذشتہ سال اسی تاریخ کو سید صاحب کا حادثہ وفات پیش آیا اور اس سال بھی اسی تاریخ کو ان کے اس ہیرو نے حیات جاودانی کی راہ اختیار کی۔

پروفیسر سید حسن کی تالیفات میں حافظ شیرازی کے ہمعصر فارسی شاعر رکن صاین ہروی کے دیوان کو خاص اہمیت ہے جس پر انھوں نے ایک عمدہ مقدمہ تحریر کیا ہے، اس کے علاوہ بہار کے صوفی اور فارسی شاعر مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی کے مجموعہ اشعار کو اور شمس الدین فقیر دہلوی کی مشہور مثنوی والہ و سلطان کو مرتب کر کے شائع کیا، اردو میں ان کے تحقیقی مضامین کے دو مجموعے سلک گلک اور چند تحقیقی مقالے کے نام سے شائع ہوئے، اکبر الہ آبادی مرحوم کے اشعار کا ایک عمدہ انتخاب اشعار اکبر کے نام سے کیا، اس میں انھوں نے اکبر مرحوم کے سوانح اُن کے کلام کے خصائص بیان کئے اور ہمعصر شعراء سے ان کا موازنہ بھی کیا، یہ کتاب ان کے حسن ذوق کی آئینہ دار ہے، انھوں نے بہار کا اردو اسٹیج اور ڈرامہ کے نام سے ایک

کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر محققانہ شان رکھتی ہے، اس پر اردو اکیڈمی یوپی نے تین ہزار روپئے کا انعام بھی دیا تھا، شعر گوئی کا ذوق بھی تھا، سرمد تخلص کرتے تھے، اعتبار نغمہ ان کا شعری مجموعہ ہے، انگریزی میں ایک کتاب اسٹڈیز ان پرشین لٹریچر زیر ترتیب تھی بعض مقالے انڈو ایرانیکا جرنل میں بھی چھپے تھے،

وہ نماز روزے کے پابند تھے، سلسلہ چشت سے روحانی تعلق تھا جب تک والدہ زندہ رہیں ان کی غیر معمولی خدمت کرتے رہے، اپنی دنیوی کامیابیوں کو وہ ماں کی دعاؤں کی برکت اور ثمرہ سمجھتے تھے، نہایت سادہ و پاکیزہ زندگی گذاری، ان کے دوست پروفیسر سید محمد محسن سابق صدر شعبہ نفسیات کے بقول "مکمل پذیرائی، یکرنگ محبت اور خلوص ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں عنصر ہیں، رضا ور بخش میں ملاوٹ کا کہیں نام نہیں"۔ دنیا میں وہ اعزازوں سے محروم نہیں رہے، صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۷۵ء میں ان کو سند قابلیت سے سرفراز کیا، ۱۹۸۱ء میں انہیں غالب ایوارڈ ملا، ہندوستان کے علاوہ ایران و افغانستان وغیرہ ملکوں میں وہ علمی مجالس میں بلائے گئے، اکاڈمیوں نے انعام دیئے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی نیکیوں کے صلہ میں ان کو آخرت کے اصل انعام سے نوازے اور انکے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

"ع ص ا"

یاد رفتگاں

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل وفیات کے تحت یا شذرات میں اپنے دور کے جن بزرگوں اور معاصروں کی وفات پر جو تاثرات لکھے تھے وہ بہ ترتیب اس میں اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت ۳۲ روپئے۔

بزم رفتگاں

بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصروں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ۔

از سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سابق ناظم دار المصنفین و ایڈیٹر معارف اسکے دو حصے ہیں۔

قیمت حصہ دوم ۔ ۲۳ / روپئے۔

مکتوب جگن ناتھ آزاد

جموں ۲۴؍نومبر ۸۸ء

محب گرامی قدر آداب

شرمندہ ہوں اور معذرت خواہ کہ ۲۴؍اکتوبر کے عنایت نامے کا جواب آج ۲۴؍نومبر کو دے رہا ہوں یوں تو کچھ مدت سفر میں رہا۔ لکھنؤ، دیواشریف (یا دیوٰی شریف؟) دہلی اور بھوپال لیکن تاخیر کا زیادہ تر سبب غالب کا شعر ہے۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

خیر سبب کوئی بھی ہو میں اس تاخیر کیلئے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔

آپکے علم میں شاید یہ بات نہیں آئی کہ ستمبر کا سیلاب (دریائے توی کا) میرے لیے عذاب آسمانی بن کر آیا۔ اخبارات میں اس سلسلے میں جو کچھ چھپا ہے وہ اس نقصان کا عشر عشیر بھی نہیں جس سے میں دوچار ہوا ہوں۔ زندگی بھر کے کام پر پانی پھر گیا ہے۔

زندگی کے گذشتہ پچاس برس کے سفر میں کئی ایسے مقامات خود بخود سامنے آگئے جہاں علامہ اقبال کی زندگی کے بارے میں SOURCE MATERIAL ملتا چلا گیا مثلاً میونخ یونیورسٹی، کیمبرج، لاہور، کراچی، امریکا اور کینڈا کے بعض ایسے مقامات جہاں احباب نے بیش قیمت SOURCE-MATERIAL عنایت کیا۔ اب پروگرام بنا کے ان تمام شہروں یا ملکوں کا سفر عمر کے اس حصے میں کہاں ممکن ہے؟ - اور وہ تمام احباب بھی کہاں باقی ہیں جنکی امداد نے میرے سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ اس ناقابل تلافی نقصان کے بعد تو زندگی بے مصرف نظر آنے لگی ہے لیکن کیا کیجئے

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آپ نے اپنے عنایت نامے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے مضمون کا ذکر کیا ہے۔ ان کا ایک خط میں نے اکتوبر کے شمارے میں پڑھا ہے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ نومبر کا شمارہ مل جائے تو آپ کی خدمت میں خط لکھوں۔ نومبر ۸۸ء کا شمارہ ابھی تک نہیں ملا، غالباً راستے میں ہوگا۔ اگر بہت مدت پہلے آپنے بھیجا ہے تو ہو سکتا ہے ڈاک میں گم ہو گیا ہو۔ ازراہ کرم دوبارہ زحمت فرماکر ممنون کریں۔

اپنی نظم کے بارے میں ٹھیک سے میں نہیں سمجھا۔ ہو سکتا ہے جمہور نامے کا ایک حصہ ہو، "ولادت باسعادت" اب نومبر ۸۸ء کا معارف ملے تو نظم کا پتہ چلے۔ بہرطور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو میری نظم پسند آئی۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر و مباہات کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اس نظم کا فرانسیسی میں ترجمہ کر رہے ہیں، کیا یہ ترجمہ انکے کسی مقالے کا حصہ ہے یا یہ نظم الگ کتابچے کی صورت میں چھپے گی، اگر یہ نظم "ولادت باسعادت" ہے تو ایک کتابچے کی صورت میں بھی چھپ سکتی ہے، طویل نظم ہے۔ معارف میں اسلام اور اسلامیات کے موضوع پر میری بعض اور نظمیں بھی چھپی ہیں مثلاً "بھارت کے مسلمان" اور میرے کلام کے مجموعوں میں بھی ایسی نظموں کی تعداد کافی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان تمام نظموں کی طرف ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو توجہ دلائیں، اگر یہ سب فرانسیسی زبان میں ایک چھوٹی سی کتاب کی صورت میں چھپ جائیں تو کیا ہی کہنا۔

معارف کو میں کیسے بھول سکتا ہوں اسکے ساتھ میرے مراسم گذشتہ چوتھائی صدی پر محیط ہیں ہاں شرمندہ ضرور ہوں کہ برادر محترم مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے متعلق مضمون ابھی تک نہیں لکھ سکا، یہ مضمون مجھ پر قرض ہے لکھوں گا ان شاء اللہ اور تفصیل سے لکھونگا، ذرا غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودات اور زیر تحریر مضامین کے تلف ہونے کا صدمہ کم ہولے، اگرچہ یہ غم اب زندگی بھر کسی نہ کسی صورت میں ساتھ رہے گا، خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو خط لکھیں تو میرا سلام لکھ دیں۔ ممنون ہوں گا شاید آئندہ موسم گرما میں پھر یورپ کا سفر ہو۔ اب کے انکی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ والسلام

نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

بابُ التقریظ والانتقاد

السیرۃ النبویہ (طبع ہفتم)

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۵۳

خوبصورت جلد، قیمت ۳۰ ریال سعودی پتہ: دارالشروق - جدہ

سیرت نبویؐ مسلمانوں کا بہت محبوب موضوع ہے، اس پر ہر دور میں کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور آیندہ بھی جاری رہے گا، عربی تو در کنار اردو میں بھی سیرت پر کئی عظیم الشان کتابیں موجود ہیں، بظاہر اس قدر عام موضوع پر نہ کسی نئی کتاب کی ضرورت ہے، اور نہ سیرت کی بے شمار مقبول تصنیفات کی موجودگی میں کسی نئی تصنیف کے لیے حسنِ قبول حاصل کرنا ممکن ہے، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سیرت ہر عہد، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے اسوہ اور نمونہ ہے، آپؐ کی دعوت اور آپؐ کا پیغام عالمگیر اور دائمی ہے، جس پر کبھی خزاں طاری نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تر و تازگی اور شادابی ہمیشہ قائم و باقی رہے گی اور ہر زمانہ میں تلاش و تحقیق اور بحث و نظر کے نئے پہلو اور نئے گوشے سامنے آتے رہیں گے اور ہر عہد کے لوگوں کو اس میں ہدایت و ارشاد اور حسنِ عمل کا تازہ پیام ملتا رہے گا اور مولانا حالی مرحوم کے بقول "پر تازگی وہی ہے اس قصۂ کہن میں" کا منظر سامنے آتا رہے گا۔

دراصل کوئی خیال نیا اور انوکھا اور کوئی بات نرالی اور اچھوتی نہیں ہوتی ع

هل غادر الشعراء من متردم

سارا کرشمہ اندازِ بیان کی رعنائی، اسلوبِ تحریر کی دلکشی اور جدتِ ادا کا ہوتا ہے، پرانے خیال اور پامال مضمون میں بھی حسنِ ادا اور جادو بیانی سے چار چاند لگ جاتا ہے، معمولی اور روز مرہ کی بات بھی دلکش انداز اور دلآویز پیرایہ میں کہی جاتی ہے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے، اچھے اہل قلم اور نابغہ روزگار مصنفین پرانی روش میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلا لیتے ہیں ع اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں

علم و فن، شعر و ادب اور فلسفہ و حکمت میں اختراع و ایجاد کی گنجایش اور وسعت و ترقی کی راہ سدا سے کھلی ہوئی ہے، تحقیق کا قدم برابر آگے بڑھتا رہا ہے، گذشتہ ادبی سرمایے اور قدما کے علوم و فنون کے ذخیرے میں ہمیشہ اضافے ہوتے رہے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کو بچپن ہی سے فنِ سیرت سے والہانہ شغف رہا ہے اور اسی زمانہ سے وہ اس موضوع کی چھوٹی اور بڑی کتابوں کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور انہماک سے کرتے رہے ہیں، اس بنا پر اگر وہ یہ کہیں کہ "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" تو بیجا نہ ہوگا لیکن سیرت نبویؐ سے اس قدر غیر معمولی اشتغال اور والہانہ لگاؤ کے باوجود انہیں اس موضوع پر مستقل کتاب لکھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی حالانکہ وہ اپنے گہرے شغف اور وسیع مطالعہ کی بنا پر سیرت پر ایک نئی اور مستقل کتاب کی ضرورت عرصہ سے محسوس کر رہے تھے، ظاہر ہے محض تبرک اور موضوع کا تقدس ہی اس کا متقاضی نہ تھا اور نہ سیرت کے مصنفین کی طویل فہرست میں اپنے نام کا اضافہ کرنا ہی مقصود تھا گو ایک مسلمان اور عاشق نبیؐ کے لیے یہ بات بھی مایۂ فخر و سعادت اور بڑی اہم ہے ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

۱۹۷۷ء میں پہلی بار مولانا کے قلم سے السیرۃ النبویہ کے نام سے عربی میں سیرت پر یہ اہم کتاب نکلی جس کا ساتواں ایڈیشن قدرے ترمیم و اضافہ کے بعد گذشتہ برس بیروت سے شایع ہوا ہے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کے بھی کئی ایڈیشن چھپے ہیں، اردو ترجمہ کی سعادت مولانا کے برادرزادہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے حصہ میں آئی،

فاضل مصنف نے مقدمہ میں خود واضح کیا ہے کہ سیرت کی نئی کتاب کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے اور سیرت نگار کو کن امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، اس موضوع کی نزاکت و اہمیت، اس کی وسعت و ہمہ گیری اور اس کی مشکل و دشواری کا بھی انہیں بخوبی اندازہ ہے نیز آپؐ کی اور دوسرے اشخاص و ممتاز افراد کی سیرتوں کا فرق بھی ان سے مخفی نہیں ہے اس لیے سیرت کی نئی کتاب کی ضرورت و اہمیت کے شدید احساس کے باوجود مولانا عرصہ تک اس کی ترتیب و تالیف کے بارے میں متردد رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے شرح صدر عطا فرمایا تو انھوں نے قدیم و جدید کتب سیرت کو پوری طرح کنگھالنے اور اس کے اولین و بنیادی ماخذ کتاب و سنت سے مکمل استفادہ کے بعد یہ کتاب لکھی، جو رطب و یابس ہر قسم کے معلومات کا مجموعہ نہیں ہے، مصنف نے اس کا پورا خیال رکھا ہے کہ جو کچھ لکھیں نقد و تبصرہ اور بحث و تمحیص کے بعد لکھیں اور یہ کتاب علمی و دعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض فاضل اور مخلص دوستوں نے مجھے آمادہ کیا کہ عربی زبان میں سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھوں جس میں نئی نسل کے ذوق و فہم کی مکمل رعایت کی گئی ہو

اور جو اس کے ذہن و دماغ اور نفسیات کے عین مطابق ہو، وہ دور حاضر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور نئے علمی نہج و اسلوب اور تحقیق کے جدید معیار کا حق بھی ادا کرتی ہو، کیونکہ ہر زمانہ کی خاص زبان اور مخصوص اسلوب بیان ہوتا ہے"

(السیرۃ النبویہ ص۱۸)

اسی سلسلۂ بیان میں ان کی یہ تنبیہ غور طلب ہے کہ

"سیرت کی کتاب کو اپنی خواہشات و اغراض کا تابع اور ان علمی نظریات سے ہم آہنگ نہیں بنانا چاہیے جو صبح و شام بدلتے رہتے ہیں علاوہ ازیں اس کو ان شکوک و اعتراضات سے خالی ہونا چاہیے جو دینی تعصب، جہالت، کم علمی یا سیاسی اغراض کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں" (ایضاً ص۱۸)

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

ذیل میں اس کی چند امتیازی خصوصیات کی نشاندہی مقصود ہے،

۱- عہد و ماحول کے متعلق معلومات | نبوت کا آفتاب جس عہد و ماحول میں طلوع ہوا اس کے بارے میں مولانا نے جس قدر مفصل معلومات بیان کیے ہیں اس کی مثال دوسری کتب سیرت میں نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس پر بڑے وسیع پیمانے پر کام کرنے کا پہلے ہی موقع عطا فرمایا تھا، ان کی جس تصنیف نے پہلی دفعہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کے اہل علم و اصحاب نظر کو ان کی جانب متوجہ کیا وہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ہے، السیرۃ النبویہ کے ابتدائی حصہ "العصر الجاہلی" میں انھوں نے بعثت نبویؐ کے وقت کی دنیا کا نقشہ کھینچ دیا ہے جس سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے اور عالمگیر جاہلیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے جو اس وقت پوری انسانی

دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے اس دور میں ایک نبی کو بھیجے جانے کی شدید ضرورت تھی، مولانا نے بتایا ہے کہ اس کے لیے سرزمین عرب کا انتخاب کیوں کیا گیا؟

پھر جس ملک اور جس شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی اس کے بقدر ضرورت تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی حالات بھی بیان کیے ہیں، عرب اور مکہ کے کسی قدر حالات و معلومات تو سیرت کی عام کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن دار الہجرت مدینہ منورہ کے طبعی، جغرافیائی، سماجی، تمدنی اور اقتصادی حالات کے ذکر سے مخصوص کتب سیرت خالی ہیں،

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طائف کی اہمیت اور اس کے حالات بھی درج ہیں خصوصاً اس کی خوش حالی و فارغ البالی اور دولت و ثروت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہاں شراب، چمڑے اور عطر کی انڈسٹریاں تھیں، امرا گرمی کا زمانہ یہاں گذارتے تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانہ کے مشہور امراء و سلاطین کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دی، آپؐ کے نامہ ہائے مبارک کے مندرجات اور سلاطین کے ناموں کا ذکر عام کتابوں میں ملتا ہے مگر مولانا نے من ھم ھٰؤلاء الملوک (یہ بادشاہ کون تھے) کا عنوان قائم کر کے ان کے متعلق تلاش و جستجو سے جو معلومات بیان کیے ہیں، ان سے ان سلاطین کے مرتبہ و حیثیت کا تعین ہو جاتا ہے جس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم اقدام کی اہمیت و نوعیت اور خطوط لکھنے کی غرض و غایت مکمل طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔

۲۔ اختصار | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بیان میں مورخین اور اصحاب سیر

نے ضعیف اور رطب و یابس روایات کا انبار لگا دیا ہے اور بڑی مضمون آفرینی اور خیال آرائی بھی کی ہے مگر مولانا نے روایتوں اور عبارت آرائی سے تعرض کیے بغیر آپؐ کی ولادت کا حال بڑی سادگی اور اختصار سے صرف دو سطروں میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو۔

"آپؐ کی ولادت مبارکہ ۱۲ ربیع الاول عام الفیل (۵۷۰ء) دوشنبہ کو ہوئی، یہ انسانی تاریخ کا سب سے سعید اور مبارک دن تھا"

حاشیہ میں اس قدر اور لکھا ہے کہ

"مشہور روایت میں ولادت کی یہی تاریخ مذکور ہے، لیکن فلکیات کے ماہر و محقق عالم محمود پاشا مصری کی تحقیق کے مطابق دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول واقعہ فیل کے پہلے سال (۲۰ اپریل ۵۷۱ء) کو آپؐ پیدا ہوئے" (السیرۃ النبویہ ص۹۹)

آگے آپؐ کی والدہ ماجدہ کی وفات کا تذکرہ بھی مختصر مگر موثر انداز میں کیا ہے، فرماتے ہیں

"۶ برس کی عمر میں آپؐ کی والدہ آپؐ کو لیکر یثرب تشریف لے گئیں، واپسی میں ابواء کے مقام پر ان کی وفات ہو گئی، ایک طرف شفیق ماں کی جدائی کا غم اور دوسری طرف مسافرت کی وحشت و گھبراہٹ نے آپؐ کو گھیر لیا، یہ آپؐ کے لیے نئی بات نہ تھی، ولادت کے روز ہی سے اس طرح کے حالات آپؐ کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، جن کے اندر تربیت الٰہی کے جو اسرار پنہاں ہیں ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ایک حبشی خاتون ام ایمن برکہؓ آپؐ کو مکہ لائیں اور آپؐ کو آپؐ کے دادا کے سپرد کیا" (السیرۃ النبویہ ص۱۰۲)

۳۔ رسول اللہؐ ایک داعی و مبلغ تھے | مولانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے

مرتبہ شناس ہیں اس لیے انھوں نے جابجا آپؐ کی داعیانہ اور پیغمبرانہ خصوصیات واضح کی ہیں اور آپؐ کی شان قومی و ملی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں سے بہت اعلیٰ وارفع بتائی ہے، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی۔

آپؐ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو یہود سے آپؐ کا سابقہ ہوا، اگر آپؐ ان کے ساتھ نرمی و ملاطفت کا معاملہ اور مصلحت آمیز رویہ اختیار کرتے تو ان کی مخالفت اور دشمنی سے اپنے کو بچالیتے لیکن آپؐ نے قومی لیڈروں کا انداز و طریقہ اپنانے کے بجائے پیغمبروں کے اصول کے مطابق ان کے معاملہ میں کوئی لچک گوارا نہ کی۔ مولانا سید ابوالحسن طلائع علی اعداء الیھود (یہود کی دشمنی کا آغاز) کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں۔

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی سیاسی لیڈر ہوتا تو اس صورت حال کے پیش نظر جس سے آپؐ مدینہ میں دوچار تھے، یہود کی خوشامد اور منھ بھرائی کا رویہ اختیار کرتا اور ان کی ناراضگی اور دشمنی اور ان کی مخالفت و عناد کا خطرہ مول نہ لیتا لیکن آپؐ خدا کے رسول تھے جو تبلیغ و دعوت اور حق کا واشگاف انداز میں اعلان کرنے پر مامور تھے، آپؐ کو حق و باطل میں امتیاز کرنے اور فساد و گمراہی کا ساتھ نہ دینے کا حکم دیا گیا تھا اس لیے آپؐ نے دنیا کی تمام قوموں اور جماعتوں کو جن میں یہود و نصاریٰ بھی شامل تھے اسلام کی برملا دعوت دی جس کے نتیجہ میں آپؐ کو ہر قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اپنی حق گوئی اور بے لچک رویہ کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

نبوت کا اصلی نہج اور حقیقی طغرائے امتیاز یہی ہے جس پر آپؐ سے پہلے کے تمام انبیاءؑ بھی کاربند رہے ہیں، یہیں سے نبوت و سیاست کے فرق اور انبیائے

مرسلین اور قومی رہنماؤں میں امتیاز کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے" (السیرۃ النبویہ ص ۲۴۵)

یہود کے عقائد و طرز زندگی اور اخلاق و سیرت سے تعرض کا انجام آپؐ کو یہ بھگتنا پڑا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے سینوں میں عداوت بھڑک اٹھی اور وہ کھلے اور چھپے ہر طرح سے اسلام کی مخالفت کرنے لگے اور اہل کتاب ہونے کے باوجود مشرکین کے مقابلہ میں آپؐ کے ہم نوا نہ بن سکے۔

معراج کے بیان میں بھی نبوت و سیاست کے اس حد فاصل اور خط امتیاز کو واضح کیا ہے، رقمطراز ہیں:۔

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم و ملک کے لیڈر ہوتے یا کسی خاص گروہ ہی کے لیے نجات دہندہ یا کسی خاص مجد و شرف کے بانی ہوتے تو آپؐ کو معراج اور عالم ملکوت کے سیر و مشاہدہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ اسی کی احتیاج تھی کہ آپؐ کے ذریعہ ارض و سما کا یہ نیا تعلق قائم ہو، اس کے لیے خود آپؐ کی سرزمین، آپؐ کا ماحول اور وہ سوسائٹی کافی تھی جس میں آپؐ زندگی بسر کر رہے تھے، اسے چھوڑ کر کسی اور خطہ زمین کا رخ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی چہ جائیکہ آپؐ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ یا مسجد اقصیٰ تشریف لے جاتے جو آپؐ کے شہر سے کافی فاصلہ پر عیسائی مذہب اور رومی حکومت کے زیر نگیں تھی، اسراء کا واقعہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہؐ ان قومی و ملی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں سے بالکل ہی مختلف تھے جن کی کوششوں اور سرگرمیوں کا دائرہ ان کے قبائل اور ملکوں ہی تک محدود رہتا ہے اور ان سے صرف ان کی نسل و قوم ہی کے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں بلکہ آپؐ کا تعلق انبیاءؑ کی جماعتوں اور رسولوں کے اس گروہ سے ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں

کو اور خالق کا حکم مخلوق کو پہنچاتے ہیں اور ان سے پوری نوع انسانی کو نفع و فائدہ پہنچتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی قوم و نسل، کسی گروہ و طبقہ اور کسی دور اور زمانہ سے کیوں نہ ہو" (السیرۃ النبویہ ص۱۵۰)

ایک اور طویل بحث سے یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے گا، لکھتے ہیں

"آپ رفق و لینت، ضبط و تحمل اور عفو و درگزر کا پیکر تھے، لوگوں کی لغزشوں اور خطاؤں سے چشم پوشی کرنے میں اس حد انتہا کو پہنچے ہوئے تھے جس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے باوجود دین کے معاملہ میں نہایت غیرت مند تھے، کسی حال میں اس کی حقیقت اور اصلی روح کو غائب نہ ہونے دیتے خصوصاً اس کی تعلیمات اور عقیدۂ توحید پر کوئی آنچ نہ آنے دیتے، اپنی امت کو وہم و غلو اور شخصیتوں کے تقدس و عظمت میں حد اعتدال پر قائم رہنے اور جاہلیت کی طرف بازگشت سے بچے رہنے کی تاکید فرماتے، قائدانہ مصلحتوں اور سیاسی لیڈروں کی حکمت عملی سے باز رہتے اور حق کے معاملہ میں کوئی رو رعایت اور ادنیٰ نرمی و مداہنت گوارا نہیں فرماتے، اس کی ایک بہت نمایاں مثال آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات کا واقعہ ہے، اسی روز جب سورج میں گرہن لگا تو لوگوں نے کہا اس کا سبب حضرت ابراہیمؑ کی وفات ہے، یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سورج اور چاند اللہ عزوجل کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات یا اہم واقعہ و حادثہ کی بنا پر ان میں گرہن نہیں لگتا، جب تم ایسا دیکھو تو خدا سے دعا کرو، اس کی بڑائی بیان کرو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو، آپ کی جگہ کوئی سیاسی رہنما، قومی لیڈر، اور کسی تحریک کا بانی ہوتا تو ایسے جذباتی اور غمناک واقعہ سے جو موقع کے عین مناسب تھا فوراً فائدہ اٹھاتا اور اس کی اسی لحاظ سے

تعبیر و تشریح کرتا یا کم از کم سکوت ضرور اختیار کرتا کیونکہ یہ اپنی شخصیت کو بلند و بالا کرنے، خاندان میں وقار حاصل کرنے اور لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کا اچھا اور زریں موقع تھا، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کی قوموں اور جماعتوں کے رہنما اور حکومتوں کی داغ بیل ڈالنے والے تمنا کرتے ہیں اور اس کے لیے ہزاروں تدبیریں اور جتن کرتے ہیں، خداوند قدوس نے غیبی طریقہ پر اس کی صورت آپ کے لیے پیدا کر دی تھی اور اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہ تھا کہ آپ سکوت اختیار فرماتے لیکن نہ آپ کو یہ بات سننا گوارا ہوئی اور نہ کسی مصلحت کی خاطر آپ نے خاموشی سے کام لیا بلکہ آپ نے اس وہم کو زائل کرنے میں سبقت و عجلت فرمائی جو فساد عقیدہ کا موجب ہو سکتی تھی اور آپ نے اسے ایک طبعی و تکوینی حادثہ بتاتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح عام مخلوقات کے ساتھ ایسی باتیں ہوتی ہیں اسی طرح انبیاءؑ اور ان کی اولاد اور خاندان کے افراد کے ساتھ بھی حوادث پیش آتے ہیں، سورج اور چاند کے گرہن میں کسی کی موت و حیات کا کوئی دخل نہیں ہوتا،

دراصل بندوں کی عظمت کے تصور ہی کی راہ سے گزشتہ قوموں میں شرک داخل ہوا، اس لیے آپ نے اس جاہلانہ فکر کی کلی نفی فرما کر صحیح حقیقت واضح کر دی اور ایک مخصوص نماز صلوٰۃ خسوف کو مشروع فرمایا تاکہ اللہ سے تعلق میں اس عبادت سے اضافہ ہو جائے اور عقل و ذہن سے جاہلیت کے سارے جراثیم کا قلع قمع ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بھی سکوت سے کام نہیں لیا جب

ایک شخص نے کہا ماشاء اللہ وشئت یعنی جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں تو آپ
نے ارشاد فرمایا اجعلتنی للہ ندا (کیا تو نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا) ایک صاحب
نے خطبہ دیتے ہوئے کہا "من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما
فقد غوی" تو آپ نے فرمایا بئس خطیب القوم انت

یہی وہ مواقع ہیں جہاں نبوی موقف پوری طرح تابناک اور روشن دکھائی
دیتا ہے۔ اور یہیں سے انبیاء علیہم السلام اور سیاسی رہنماؤں اور قومی وملی لیڈروں
کی سرحدیں بالکل جدا ہوجاتی ہیں، عام قائدین اور زعما اپنے کو دوسرے انسانوں
سے ممتاز اور فائق بتاتے ہیں، عظیم حوادث وواقعات کو اپنی طرف منسوب کرکے
لوگوں کو اخفت عقل سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی مدح وتحسین کی کھلی ہوئی چھوٹ
دے دیتے ہیں اور یہیں حد اعتدال سے تجاوز ہوجاتے کی بھی پرواہ نہیں کرتے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء تھے، آپ کی ذات اس معاملہ میں اسوۂ کامل تھی،
آپ نے ارشاد فرمایا

نصاریٰ نے جس طرح حضرت مسیح ابن مریمؑ کا درجہ بڑھایا تھا اس طرح میرا
درجہ نہ بڑھانا، میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں" (السیرۃ النبویہ ط [illegible])

۴۔ سیرت نبوی درس وپیام ہے

جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ مبلغ وداعی تھے اور آپ کی زندگی
اور سیرت طیبہ ساری دنیا کے لیے رشد وہدایت کا درس وپیام تھی تو آپ کے سیرت نگار
کو آپ کی دعوت وسیرت کا عطر وجوہر کھینچ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا اور اس کے
سبق آموز پہلوؤں کو پوری طرح بے نقاب کرنا چاہیے، مولانا خود بھی داعی ومبلغ ہیں،
اس لیے انھوں نے جابجا اس پہلو کو نمایاں کیا ہے اور سیرت نبوی کے درس وپیام موثر

حالات وواقعات اور ایمان وحرارت سے معمور تحریروں کو پیش کرکے نوعِ انسانی کو اپنی
زندگی کی تعمیر وتزیین پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے، چند مثالوں سے بات واضح ہوگی۔

"آپ کی ہجرت سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت وعقیدہ کے مقابلہ میں ہر چیز ہیچ
ہے، ان کے لیے ہر محبوب وعزیز اور مانوس ومالوف چیز کو قربان کیا جاسکتا ہے،
لیکن ان کو کسی حال میں چھوڑا نہیں جاسکتا، مکہ آپ کا اور صحابہ کرام کا وطن تھا یہیں
خدا کا گھر تھا جس کی محبت ان کی روح وجسم میں پیوست تھی مگر دعوت وعقیدہ کیلئے
آپ کو اور صحابہ کرام کو اپنا پیارا وطن چھوڑنے اور اعزہ واقربا کو خیرباد کہنے میں تامل
نہیں ہوا مکہ آپ کو کس قدر پیارا تھا اس کا اندازہ آپ کے اس ارشاد گرامی سے
بخوبی کیا جاسکتا ہے جو ہجرت کے وقت آپ نے مکہ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا
"تو کتنا عمدہ شہر ہے اور مجھے کس قدر پیارا ہے اگر میری قوم مجھ سے جدا نہ کرتی تو
میں تجھے چھوڑ کر کسی اور جگہ سکونت اختیار نہ کرتا" (ایضاً ص ۱۴۲)

۷ھ میں آپ نے عمرہ کی نیت سے مکہ کا سفر کیا اس واقعہ کے ایک خاص موثر
اور سبق آموز پہلو کو مولانا نے اس طرح پیش کیا ہے

"اسلام نے دل ودماغ میں کیسا زبردست انقلاب پیدا کردیا تھا، وہی لڑکی جو پہلے
عرب کے لیے باعث ننگ وعار تھی اور بعض قبائل میں اس کو زندہ دفن کرنے کی رسم
بھی پائی جاتی تھی اب اس قدر محبوب اور عزیز سمجھی جانے لگی کہ اس کی پرورش و
پرداخت کے لیے باہم مسابقت ہونے لگی چنانچہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
مکہ سے واپس آنے لگے تو حضرت حمزہؓ کی ایک بچی چچا چچا پکارتے ہوئے آپ کے
ساتھ ہوگئی حضرت علیؓ نے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور حضرت فاطمہؓ کے حوالہ کرکے

کہا دیکھو یہ چچا کی لڑکی ہے، اس کے بعد ان میں اور حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ میں کشمکش شروع ہوگئی، حضرت علیؓ نے فرمایا میں اسے لے چکا ہوں، یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، حضرت جعفرؓ بولے یہ میری بھی چچا زاد بہن ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے، حضرت زیدؓ نے کہا میرے بھائی (اسلامی رشتہ سے) کی لڑکی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچی کو حضرت جعفرؓ کے سپرد کیا کیونکہ اس کی خالہ ان کے نکاح میں تھیں اور فرمایا کہ خالہ ماں کی جگہ پر ہوتی ہے" (السیرۃ النبویہ ط ۳۲۲ و ۳۲۳)

حجۃ الوداع کے بیان میں حج نبویؐ کی تبلیغی و تربیتی اہمیت اور اس کا درس و سبق اس طرح بیان کیا ہے

"آپ کا یہ حج ہزار درس و تعلیم اور ہزار وعظ و پند کا قائم مقام تھا، یہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ، متحرک مسجد اور گردش کرنے والی چھاؤنی تھی جس میں جاہل علم سیکھتا، غافل متنبہ ہوتا، کاہل چاق و چوبند اور کمزور توانا ہوتا، یہ رحمت کی ایک گھٹا تھی جو سفر و حضر میں ان پر چھائی رہتی، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و شفقت، تربیت و رہنمائی اور نگرانی کی گھٹا تھی (السیرۃ النبویہ ص ۳۸۵)" ض

(باقی)

دائرۃ المعارف النبویہ

دارالمصنفین کا شاہکار سلسلہ "سیرۃ النبیؐ"

یہ سات حصوں پر مشتمل ہے، اس کے پہلے دو حصے علامہ شبلیؒ کے قلم کے ہیں، بقیہ پانچ حصے ان کے لائق جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم کے ہیں، اس کے ساتویں حصہ پر جو مکمل نہیں ہو سکا تھا یہ مقدس سلسلہ ختم ہوگیا، (قیمت ہر حصہ کی علی الترتیب) اول ۳۰ دوم ۳۳ سوم ۵۸ چہارم ۵۸ پنجم ۴۰ ششم ۵۸ ہفتم ۲۳ روپیے۔

مطبوعات جدیدہ

العلل و معرفۃ الرجال عن الامام احمد بن حنبل: تحقیق و تحشیہ ڈاکٹر وصی اللہ بن محمد عباس، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۴۲۳ مع ڈسک کور، قیمت تحریر نہیں، پتہ الدار السلفیہ ۸/۱۶ ای حضرت ٹیرس، انیکس شیخ حفیظ الدین روڈ، ممبئی، ۴۰۰۰۰۸۔

الدار السلفیہ ممبئی نے سلف کی اہم کتابوں کو شایع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو امام سنت احمد بن حنبلؒ کے جرح و تعدیل پر مشتمل ان اقوال کا مجموعہ ہے جن کو ان کے دو تلامذہ ابوبکر احمد مروزی اور ابوالحسن عبدالملک میمونی اور صاحبزادے ابوالفضل صالح نے ان سے نقل و بیان کیا ہے، اس میں حدیثوں کے علل اور رجال کی قوت و ضعف کے بارے میں امام صاحب کے علاوہ دوسرے اہل فن کے آرا بھی جمع کیے گئے ہیں، کتاب کی تحقیق و تحشیہ کا کام ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس نے محنت سے انجام دیا ہے، شروع میں انھوں نے امام احمدؒ اور ان سے اس کتاب کو روایت کرنے والے تینوں بزرگوں کے مختصر حالات بھی دیدیے ہیں اور آخر میں کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، یہ کتاب بھی الدار السلفیہ کی معیاری اور روایتی طباعت کا نمونہ ہے جس کے اور اس نایاب کتاب کی اشاعت کے لیے اہل علم کو مولانا مختار احمد ندوی کا ممنون ہونا چاہیے۔

علامہ شوق نیموی حیات و خدمات: ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن قاسمی، تقطیع خورد، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۶، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتے (۱) کتاب منزل سبزی باغ، پٹنہ ۴۰۰۰۰۸ (۲) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد، دہلی ۶۔

مولانا ظہیر احسن شوق نیموی بڑے کامل الفن مصنف تھے، عربی، فارسی اور اردو تینوں

زبانوں میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، دینی علوم میں تبحر کے ساتھ ہی ان کو شعر و ادب کا بھی اچھا ذوق تھا، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن قاسمی نے ان پر عربی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر پٹنہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی جس میں ان کی خدمات حدیث پر زیادہ بحث و گفتگو کی گئی تھی اب انھوں نے اس میں مولانا شوق کے اردو میں ادبی و تحقیقی کارناموں کا حصہ بڑھا کر کتابی صورت میں شایع کیا ہے جو بارہ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے دو ابواب میں ہندوستان اور بہار میں علم حدیث کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، اس ضمن میں بعض مشہور محدثین کا مختصر حال بھی قلمبند کیا ہے، یہ دونوں ابواب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مشہور عالمانہ و محققانہ مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" کی تلخیص ہیں، تیسرا اور چوتھا باب مولانا کے خاندانی اور نجی حالات پر مشتمل ہے، جن لوگوں کو شعر و سخن میں ان سے تلمذ حاصل تھا، ان کا تذکرہ پانچویں باب میں کیا ہے، آخری دونوں ابواب میں مولانا نیموی کی علم حدیث میں بلند پائیگی کا ذکر ہے اور دسویں باب میں ان کی مذہبی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، ان ابواب سے مولانا کی علمی عظمت، فقہ و حدیث میں مہارت اور حنفی مذہب کی خدمات کا پتہ چلتا ہے، درمیان کے چار ابواب میں مولانا کی ادبی و لغوی خدمات اور شاعرانہ کمالات پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے ان میں ان کی ادبی تصنیفات کا تعارف، مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی اور ہر صنف میں شاعرانہ خصوصیات نیز زبان دانی اور ادبی و لغوی تحقیق کے نمونے دیئے گئے ہیں، زبان دانی اور تحقیق کے ضمن میں مشہور استاذ فن اور زبان داں جلال لکھنوی سے بعض لفظوں کی تحقیق میں شوق کے اختلاف کی تفصیل دی ہے، ایک باب میں ان کے متعلق مشہور ادیبوں اور شاعروں کی رائیں نقل کر کے ان کی ادبی و شعری عظمت دکھائی ہے مولانا ظہیر احسن شوق نے بہت کم عمر پائی مگر اس کے باوجود انھوں نے بڑا ادبی، علمی اور دینی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، لیکن ابھی تک ان پر کوئی سیر حاصل کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی بڑی حد تک پوری ہو گئی ہے۔ البتہ اس میں کسی قدر طوالت اور کہیں کہیں تکرار بھی ہے۔

"ض"